میں جس گھوڑی پر سوار تھا۔ وہ بہت بڑی اور تیز رفتار تھی میرے ساتھ کا بردالا (چوکیدار) غالباً قوم کا کشمیری ساکن بھاگووال سرداراں ضلع گورداسپور تھا۔ چک نمبر ۶۲ میں بھاگووال ضلع گورداسپور کے سکھ لوگ ہی جا کر آباد ہوئے تھے۔ اور وہ گاؤں بھی بھاگووالہ ہی کہلاتا تھا۔

میرے گھر سے نکل آنے کے بعد گھر والوں پر میری جدائی اور رونے کا اتنا گہرا اثر ہوا۔ کہ میرے بعد پھر گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور جب والد صاحب اور میرے بھائی مجھے الوداع کہکر واپس گھر گئے۔ تو والدہ نے بہت اصرار کیا۔ کہ میرے لڑکے کو واپس لے آؤ۔ میں نہیں بھیجتی۔ مریگا تو آنکھوں کے سامنے تو ہوگا۔ والد صاحب پر بھی ان کلمات کا اثر ہوا۔ اور انہوں نے پھر کوشش کی کہ مجھے واپس بلوالیں۔ مگر میں چونکہ جلد جلد نکلنے کی فکر میں تھا۔ اور رات بھی اندھیری تھی۔ ہمیں لوٹانے کی کوشش کرنیوالا ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اور اس طرح ہم بے روک ٹوک جلد جلد اپنا سفر کاٹتے چلے گئے۔

چک نمبر ۶۲ بھاگووال سے ڈجکوٹ اور وہاں سے گوگیرہ پہنچنا تھا۔ میلوں کا تو مجھے حساب نہیں مسافت دور کی تھی۔ راستہ خوفناک تھا۔ چوروں کا خطرہ اور پانی کی قلت تھی۔ کئی گھنٹہ چلنے کے بعد سحر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمیں آرام کرنے پر مجبور کر دیا چنانچہ ایک کفِ دست میدان میں گھوڑی کا رسہ ہاتھ میں تھام کر ہم دونوں کمر سیدھی کرنے لیٹ گئے۔ شب بیداری۔ تکان اور اس پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ ہماری آنکھ لگ گئی۔ اور پھر اچانک گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چونکہ دن نکلنے اور پو پھٹنے کے آثار تھے۔ سوار ہو کر پھر جلدی جلدی چلنے لگے۔

دن چڑھا۔ سورج نکلا۔ اور ہوتے ہوتے ۹ بجے کا وقت ہوا ہوگا۔ کہ میرے ساتھی نے چوروں کا خطرہ محسوس کیا۔ اور مجھے بتایا۔ کہ بہت دور سے دو دو آدمی ہمارے ساتھ ساتھ کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی پہلو پر راستہ کاٹتے ہوئے آنکھ بچا کر آ رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہمارے تعاقب میں صرف موقعہ کی تلاش میں ہیں۔ گھوڑی بہت بڑی تھی اور قیمتی تھی۔ اور اس علاقہ میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں نے احتیاطاً اپنے ساتھی کو بھی گھوڑی پر بٹھا لیا۔ اور کوشش کر کے گھوڑی کو جلدی جلدی چلانے لگے۔ حتّٰی کہ چند میل کے سفر کے بعد ہم نے دیکھا وہ لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔

چوروں کا خطرہ بھی اور منزل پر پہنچنے کا خیال بھی۔ اس لئے ہم نے کہیں آرام نہ کیا۔ اور سفر کو مسلسل جاری رکھا۔ پیاس نے راہ میں بہت ستایا مگر انہی خیالات کی وجہ سے پانی کی بھی تلاش نہ کی۔ بہت تنگ ہوئے۔ تو راستہ پر ایک بکری والے کی بکریوں کے دودھ سے پیاس بجھانے کی کوشش کی۔ آخر خدا خدا کر کے دریائے راوی کے آثار نظر آئے آبادی دکھائی دینے لگی۔ اور چلتے پھرتے آدمی دکھائی دیئے۔ تب جا کر جان میں جان آئی۔ اور خدا خدا کر کے شام سے پہلے ہی پہلے بلکہ عصر کے وقت ہم لوگ گوگیرا کی بستی میں پہنچ گئے۔ جہاں سے میں یکّے پر سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔ اور بردالے کو خرچ دے کر وہیں رات رہنے اور دوسرے روز صبح واپس جانے کی تاکید کر گیا۔

یہ عجائبات قدرت ہیں۔ جن کا میں نے مجمل سا بیان لکھا ہے۔ اور واقعات ہیں۔ بناوٹ اور مبالغہ کا ان میں دخل نہیں۔ خدائے قادر و توانا کے بھیدوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ اور قدرت کی اس کتاب کے باریک در باریک اسرار و معارف کی تہ تک اس کے مقدسین کے سوا کون پہنچ سکتا ہے؟

ممکن ہے کسی کو ان واقعات کے علم سے تعجب پیدا ہو۔ اور میرے ظاہری حالات، میری کم عمری و بچپن یا میری خاموشی و کم گوئی کے مدّنظر سوءِ ظن کی بلا کا شکار ہو کر ان باتوں کو بناوٹ یا مبالغہ سمجھے۔ مگر کوتاہ بین ہوگا ایسا شخص اور خدا تعالےٰ کی صفات کا منکر ہوگا ایسا انسان وہ کیا جانتا ہے۔ کہ خدا کے اپنے بندوں میں اسرار ہوتے ہیں۔ جن کو ظاہر بین نظر احاطہ بھی نہیں کر سکتی۔

میں ان حالات کے لکھتے وقت لاحول اور استغفار کا ورد کر رہا ہوں۔ اور خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ کہ ان کے اظہار سے میرے نفس میں کوئی فخر، عُجب یا پندار کا شائبہ پیدا ہو۔ کیونکہ ان امور میں میری عقل طاقت یا سمجھ کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اور یہ محض خدا کا فضل اور اس کی عطاء و دین ہے۔ کہ اس ذات والاصفات نے مجھ ناکارہ سے ایسے سلوک فرمائے۔ اور محیر العقول سامان میرے واسطے مہیّا کئے۔

میں محض تشکّر اور امتنان کی نیت سے اور اس خیال سے کہ سیدنا حضرت اقدس فضلِ عمر فخرِ رسل اولوالعزم مظہر الحق والعلیٰ کان اللّٰہ نزل من السماء جیسے خلیفۂ وقت پسر موعودؑ نے بعض خطبات میں مجھ ناکارہ کے بعض حالات کا تذکرہ فرمایا۔ اور پھر میرے عزیز و مکرم مرزا برکت علی صاحب آف آبادان نے بار ہا اصرار کیا۔ اور بالآخر اس نیت و غرض سے کہ شائد کوئی صاحب حال نیک نفس اور پاکدل انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملّت سے تعلق رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو میرے ان حالات سے متاثر ہو۔ اور خدا کو پانے کے لئے کمر ہمّت باندھ سکے۔ طبائع مختلف ہیں۔ ممکن ہے کسی قلب صافی کیلئے میرے حالات ہی خضرِ راہ بن جائیں۔ وما ذالک علی اللّٰہ ببعید

اس جملہ معترضہ کے بعد میں اصل بیان کیطرف لوٹتا ہوں۔ کہ گوگیرہ سے میں اس خیال سے بغیر ایک منٹ ٹھہرے ریلوے اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔ کہ رات کو کوئی گاڑی لاہور کو جاتی ہوگی۔ اُس میں سوار ہو کر میعاد مقررہ کے اندر سیالکوٹ جہاں سیّد بشیر حیدر صاحب ان دنوں رہتے تھے پہنچ جاؤنگا مگر سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ گاڑی نکل چکی ہے۔ اور اب لاہور کو جانے کیلئے صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہ آئیگی میرے دل میں ملال تو ہوا۔ کہ میں گاڑی سے کیوں رہ گیا۔ مگر چارہ نہ تھا۔ ناچار دل کڑا کر کے وہیں پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا اور صبح کو روانہ ہونے والی گاڑی کے متعلق حساب لگانے لگا کہ وہ سیالکوٹ کب پہنچے گی۔ مگر مجھے اس خیال سے اور بھی مایوسی ہوئی۔ کہ میں کل شام تک سیالکوٹ نہ پہنچ سکونگا۔ میرے دل میں اپنی ساری محنت کوشش اور دوڑ دھوپ کے رائیگاں جانے کا سخت صدمہ تھا۔ اور چونکہ متواتر کئی رات کی بے خوابی کے ساتھ سفر کی کوفت اور دل کا رنج بھی جمع ہو گئے تھے۔ میری تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور آخر میں وہیں لیٹ گیا۔ اور ایسا بے ہوش ہوا کہ کوئی رنج یاد رہا نہ فکر۔ علی الصبح گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مگر میں نے نہ سنی۔ اور پڑا سویا کیا۔ آخر چوکیدار نے جگایا اور کہا۔ "اٹھو گاڑی آتی ہے"۔ میں گھبراہٹ میں اٹھا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اب کہاں جاؤں اور کدھر کا رُخ کروں۔ وقت پر سیالکوٹ تو یہ گاڑی پہنچیگی نہیں اب ہوگا کیا؟ دل ہی دل میں سوچتا تھا۔ فیصلہ کی کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔ لوگ ٹکٹ خرید کر رہے تھے۔ اور میں ابھی سوچ رہا تھا۔ کہ یکایک گاڑی سامنے آ گئی۔ اور میں بے تحاشا کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا۔ عین اسوقت اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ ٹکٹ چھانگا مانگا کا خریدو اور چونیاں چلو۔

چنانچہ میں نے چھانگا مانگا کا ٹکٹ خرید لیا۔ اور گاڑی میں سوار ہو کر خدا کی طرف جھک گیا۔ کیونکہ ہر ضرورت اور حاجت میں اُسی کو سچا دستگیر اور راہبر یقین کرتا تھا۔ چھانگا مانگا کا سٹیشن آیا۔ میں گاڑی سے اتر ایک یکّے میں سوار ہو کر چونیاں کو روانہ ہوا۔ اور چونیاں پہنچ کر چونگی خانہ کے متصل یکّہ سے اُتر ہی رہا تھا۔ کہ میرے کان میں یہ آواز آئی۔

"بھائی جی خوب آئے سید بشیر حیدر یہیں ہیں۔"

سبحان اللّٰہ۔ والحمد للّٰہ۔ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر۔ کوئی کیا جانے کہ میرے دل کی اسوقت کیا کیفیت ہوئی۔ اور میرے دل میں کیا کیا خیالات پیدا ہوئے۔ میری روح پانی کی طرح خدائے بزرگ و برتر کے آستانہ پر گری۔ اور انتہائی نیازمندی کا جوش اور ولولہ میرے قلب میں پیدا ہو گیا۔ اور ایک لمحہ کیلئے میں بے حس و حرکت بت بے جان بن کر کھڑا رہ گیا۔ اور اس سکوت اور از خود رفتگی سے آخر میرے مکرم دوست سید زین العابدین شاہ صاحب کے محبت بھرے دل اور ہاتھوں نے پرٹ کر ہوشیار کیا۔

پہلی آواز کو میں ایک غیبی آواز سمجھا تھا۔ اب اپنے یقین اور دل کی تسلّی کے لئے دوبارہ سہ بارہ شاہ صاحب سے دریافت کیا۔ کہ کیا واقعی سید بشیر حیدر صاحب یہیں ہیں؟ اور جواب اثبات میں پا کر خدا کا ہزاروں ہزار شکریہ ادا کیا۔ جس نے نہایت ہی ناموافق حالات میں میری خارقِ عادت رنگ میں مدد فرمائی۔ اور میرے اُس عہد کو پورا کر کے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ فالحمد للّٰہ

خدائے بزرگ نے جس طرح خود ہی مجھ سے پندرہ روزہ عہد کرایا تھا۔ ویسے ہی اس پاک ذات نے اس کے ایفاء کے لئے بالکل عجیب در عجیب اور خاص الخاص سامان بھی میسّر فرمائے ورنہ میں اگر اپنی سوچ و بچار یا ساخت پرداخت کے ماتحت کوئی کام کرتا۔ تو یقیناً یقیناً یہ صورت

نہ ہوتی۔ کیونکہ میں اس وقت کے حالات کے مدّنظر کرتا جو کرتا۔ اور پھر ضروری نہ تھا۔ کہ کامیابی نصیب بھی ہوتی۔ مگر جو کچھ ہؤا۔ وہ تمام ظاہری سامانوں کے سراسر خلاف ہؤا۔ اور یہی تو خدا کی خدائی اور اس کی چہرہ نمائی ہے۔

میں سید بشیر حیدر صاحب سے ملا۔ اور دوسرے بچھڑے ہوئے دوستوں سے بھی ملاقات کی۔ دو یا تین روز کے بعد سید بشیر حیدر صاحب سیالکوٹ چلے گئے۔ اور میں ایک دو روز کیلئے اور چونیاں ٹھہرا۔ چونیاں میں ہمارے سامان کا کچھ حصّہ ابھی باقی پڑا تھا۔ جو اُسی مکان کے ایک حصّہ میں مقفل پڑا تھا جس میں ہم رہا کرتے تھے۔ اُس کی چابی کسی ضرورت کے ماتحت والدہ محترمہ نے مجھے دی تھی۔ مکان کو کھول کر میں نے والد صاحب کا وہ سامان جس سے پارہ کے گلاس بنایا کرتے تھے۔ اس خیال سے نکال لیا کہ سفر میں کام آویگا۔ کیونکہ والد صاحب کو گلاس بناتے دیکھ کر میں نے بھی پارہ کا گلاس بنانا سیکھ لیا تھا۔

میں گھر سے کچھ زیادہ روپیہ نہ لایا تھا۔ بلکہ اس خیال سے استغنا برتا تھا۔ کہ والدین کو میری حصول ملازمت کا یقین رہے۔ اور میری روانگی میں روک پیدا نہ ہو۔

میں بھی دو تین روز بعد چونیاں سے روانہ ہو گیا۔ مگر نہ سیالکوٹ کو بلکہ میں اس خیال سے کہ ریاستوں میں روپیہ بہت ہوتا ہے۔ پارہ کے گلاس بنا کر فروخت کروں گا۔ اور اس طرح روپیہ جمع کر کے والدین کو بھی بھیجونگا تاکہ اُن کو تسلی رہے۔ اور پھر سیالکوٹ جاؤنگا۔

میری طبیعت میں ایک قسم کا حیا بچپن سے پایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں کسی کے ہاں جا کر بوجھ بننے سے بچتا رہتا ۔ اور ایک قسم کی غیرت بھی۔ چنانچہ اسی خیال کے ماتحت میں نے بغیر کافی روپیہ جمع کئے سیالکوٹ جا کر ایک دوست کا مہمان بننا پسند نہ کیا۔

میں ابھی جون ہی کے مہینے میں کپورتھلہ چلا گیا۔ اور چونکہ بالکل ناواقف تھا۔ اور بوجہ گھر سے کبھی نہ نکلنے کے دنیا کے نیچ اونچ سے بھی آگاہ نہ تھا۔ ایک ویران سرائے کا ایک کمرہ لیکر اُس میں ٹھہر گیا۔ اور کچھ سامان خرید کر پارہ کا ایک گلاس بنا بعض رؤساء کے ہاں لے گیا۔ لوگ گلاس کو دیکھتے۔ میں اس کی اصلیت کے ثبوت میں چند قطرے سیال پارہ کے گلاس میں ڈال دیتا جو سارے کا سارا دوسری طرف بغیر سوراخ کئے نکل جاتا۔ واہ واہ تو لوگ کرتے ۔ اور میری کاریگری کی داد بھی دیتے مگر صرف زبانی ہی زبانی۔ نہ کسی کا ہاتھ جیب کی طرف جاتا اور نہ خریدار بنتا۔ میں ایک ایک کر کے چند امراء کے ہاں گیا۔ جن کا مجھے پتہ لگ سکا۔ مگر سب نے زبانی تعریف ہی پر اکتفا کیا۔ اور اس طرح ایک بھی گلاس نہ بک سکا۔ اور بجائے نفع کے میں اپنی گرہ سے خرچ اٹھا چکا۔

در اصل گلاس کا بنانا چنداں مشکل نہ تھا۔ مشکل تھا تو اس کا فروخت کرنا۔ جس کے لئے بڑی چرب زبانی اور لاف زنی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ مگر میں ان باتوں سے بالکل بے بہرہ تھا۔ اِس طرح مجھ پر اپنی کمزوری کا اور بھی حال کھل گیا۔ اور میں نے جان لیا۔ کہ جیسا خیال تھا۔ ویسا آسان کمانا اور کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا نہ نکلا۔

چند روز کے قیام کے بعد میں کپورتھلہ سے امرتسر بٹالہ اور ڈیرہ بابا نانک ہوتا ہؤا اپنے سسرال بمقام دیرم ونا پہنچا۔ جہاں میری بیوی رہتی تھی۔ اور قریبًا ایک مہینہ ٹھہرنے کے بعد میں پاپیادہ سیالکوٹ کو روانہ ہؤا۔ دوسرے دن سیالکوٹ پہنچ کر سیّد بشیر حیدر صاحب کی تلاش کی جو اُن دنوں ٹبہ ککے زئیاں کی جمعہ مسجد کے بالمقابل ایک موروثی بالاخانے میں قیام پذیر تھے۔

میں بالاخانے کی بیٹھک میں ٹھہر گیا۔ جو مردانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مگر کھانے کا انتظام میں نے اپنا علیحدہ رکھا۔ اور باوجود سیّد صاحب کے تقاضا اور اصرار کے کھانے کا بوجھ اُن پر ڈالنے کو پسند نہ کیا۔ میری ظاہری شکل و شباہت چونکہ ابھی ہندوآنہ تھی۔ میں بازار جا کر ہندوؤں ہی کے ہاں کھانا کھایا کرتا۔ شاہ صاحب سکول جاتے اور میں اکیلا مردانہ میں رہتا۔

تنہائی میں کسی شغل کی تلاش ہوئی۔ آخر شاہ صاحب کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر ایک کتاب جو اپنے نام کی وجہ سے مجھے بہت بھائی۔ اٹھا کر مطالعہ شروع کر دیا۔ کتاب کا نام تھا "**نشانِ آسمانی**"۔ کتاب دلچسپ اور نہائیت مناسب حال تھی۔ لہذا میں نے اُسے ختم کئے بغیر نہ چھوڑا جب یہ ختم ہو گئی۔ تو ایک اور کتاب مل گئی۔ جس کا نام تھا "**انوار الاسلام**"۔ اُسے بھی لیا۔ اور بالاقساط ختم کر دیا۔

اُن دنوں عبداللہ آتھم والی پیشگوئی کا بہت شور تھا۔ اور سکول ٹائیم کے بعد سیّد بشیر حیدر صاحب کے مردانہ پر اس مسئلہ پر عمومًا روزانہ بحث ہؤا کرتی تھی۔ جس کو میں شوق سے سنا کرتا ۔ اوپر کی دونوں کتابیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے سیّدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصنیف تھیں۔ جن میں سے انوار الاسلام میں عبداللہ آتھم والی پیشگوئی کا ذکر تھا۔ اور انعامی اشتہار بھی چار ہزار روپے تک تھے۔ اور میں نے اس کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا تھا۔

ایک فریق حضرت اقدسؑ کی صداقت پر اور دوسرا مخالفت پر دلائل دیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات بحث نہائت ہی پُرجوش رنگ اختیار کر جایا کرتی تھی۔ ایک طرف صداقت کے دلائل دینے والے سادات فیملی کے نوجوان تھے۔ جن میں سے مکرمی سید بشیر حیدر صاحب، سیّد رشید احمد صاحب اور سیّد محمد سعید صاحب کے نام مجھے یاد ہیں۔ اور مخالف پارٹی میں بعض پٹھان (ککے زئی) اور کوئی ایک دو سیّد بھی تھے غالبًا۔ میں بھی چونکہ پاس بیٹھا ہؤا کرتا تھا۔ لہذا مصدقین حضرت اقدسؑ کبھی مجھے بھی مخاطب کر لیا کرتے۔ "کیوں بھائی جی ٹھیک ہے نا۔"

میں نے چونکہ حضور کی کتاب انوار الاسلام پڑھی تھی۔ اور توجہ اور شوق سے پڑھی تھی۔ میں مصدقین کی تائید میں ہؤا کرتا تھا۔ مگر مخالفین کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ یہ کہکر کہ بھائی جی یہ ہمارے مذہبی معاملات ہیں۔ آپ ان کو نہیں سمجھتے۔ آپ نہ بولیں، روکنا چاہتے۔ مگر ایک حق بات جس کی مجھے سمجھ آ چکی تھی۔ کہنے سے میں نہ رکتا۔ اور ان کو چیلنج کیا کرتا۔ کہ مجھ سے گفتگو کریں۔ مگر وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہ کرتے۔

غرض اس طرح اس بالاخانے پر مجھے سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام کا نام پہنچا اور حضور کا کلام بھی مجھے میسّر آ گیا جس کو میں نے شوق سے پڑھا۔ اور وہ میری دل و جان میں رچ گیا۔ اس سے پہلے مجھے حضور پاک کے متعلق کوئی علم و اطلاع نہ تھی۔ گو میرے دل میں اسلام کی محبت گھر کر چکی تھی۔ اور ایمان میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہؤا تھا۔ مگر سیّدنا مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام معجز بیان پڑھنے کے بعد میرے دل میں ایک نیا نور معرفت اور عرفان پیدا ہو گیا۔ ابھی تک مجھے نماز نہ آتی تھی۔ مگر اب میں نے سبقًا سبقًا دو تین روز میں نماز یاد کر لی۔ اور باقاعدہ نماز پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ میرے میزبان پڑھتے یا نہ پڑھتے۔ مگر میں وقت پر نماز کیلئے کھڑا ہو جایا کرتا۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہؤا۔ کہ میرے پاس جو روپیہ تھا۔ وہ خرچ ہوتے ہوتے بہت تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے اس اظہار کے بغیر ہی سیّد بشیر حیدر صاحب سے چند روز کی اجازت چاہی۔ کہ اپنے بڑے چچا صاحب سے مل آؤں (میرے والد صاحب کے سب سے بڑے بھائی مہتہ ہیمراج پشاور کے پاس ایک گاؤں میں بسلسلہ ملازمت پٹوار رہتے تھے۔ اور وہیں انہوں نے مکان وغیرہ بنا لیا تھا اُن کے اولاد نہ تھی) شاہ صاحب نے پوچھا بھی کہ اگر خرچ کے واسطے جاتے ہو۔ تو نہ جاؤ۔ مگر میں نے عذر کر کے ملاقات کے لئے اجازت لے لی۔ اور قریبًا ایک مہینہ اس سفر میں میرا خرچ ہو گیا۔ چچا صاحب سے واپسی پر میں نے کچھ خرچ وغیرہ بھی لے لیا۔ اور واپس سیالکوٹ آ گیا۔ اس واپسی کے چند ہی روز بعد میں نے سیّد بشیر حیدر صاحب سے کہا۔ کہ اب میں اپنے ان خیالات کو چھپا نہیں سکتا اور چاہتا ہوں۔ کہ اظہار اسلام کر دوں۔

یہ سنکر سیّد صاحب جو دل سے چاہتے تھے۔ مگر مجھے زبانی کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ خوش ہوئے۔ اور فورًا جا کر حضرت سید میر حامد شاہ صاحب کے پاس ماجرا عرض کر دیا۔ انہوں نے وقت دیکر مجھے بلوایا۔ میں میر حامد شاہ صاحب کے مکان پر اُن کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ محبت اور اخلاص سے پیش آئے۔ اور میری زبان سے میری غرض و مقصد سنکر مجھے قریبًا ایک گھنٹہ تک نہائت مؤثر پیرایہ میں تلقین فرماتے رہے۔ شاہ صاحب نے مجھے یقین کے ہر سہ مدارج کے متعلق کھول کر سنایا اور میرے علم میں بہت قیمتی معلومات کا اضافہ فرمایا۔

مگر اظہارِ اسلام کے متعلق مجھے یہ مشورہ دیا کہ آپ کے بعض رشتہ دار چونکہ یہاں ہیں (میرے بعض

رشتہ دار پولیس اور دوسرے محکمہ جات میں معزز عہدوں پر تھے) لہذا اندیشہ ہے کہ وہ لوگ روک ڈالیں گے۔ یا شور و شر کر کے فساد برپا کریں۔ بہتر ہو کہ تم قادیان چلے جاؤ۔

قادیان کا نام اُن کی زبان سے نکلنا تھا۔ کہ میرا دل سرور سے بھر گیا اور مجھے پورا انشراح ہو گیا کیونکہ شاہصاحب سید بشیر حیدر صاحب کے بالاخانے کے قیام کے ایام میں قادیان کے نام سے بہت مانوس ہو چکا تھا میں نے شاہصاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ بہت اچھا میں قادیان چلا جاتا ہوں۔ شاہصاحب نے میرے واسطے ایک خط لکھنا شروع کیا اور میں دل میں قادیان کا ایک نظارہ بنانے میں مصروف ہو گیا اور اس بات پر خوش تھا۔ اس وقت کے خیال کے مطابق قادیان کا نقشہ جو میں نے دل میں تجویز کیا مسجد اقصےٰ کو بعینہٖ اس کے مطابق پایا۔ شاہصاحب نے خط لکھکر مجھے دیا۔ اور دعا کر کے مجھے رخصت فرمایا اور میں اُسی شام کی گاڑی سے تن کے تینوں کپڑے لیکر روانہ قادیان ہو گیا کیونکہ میرے خیال کے مطابق وہاں صرف یہی کام تھا۔ کہ کوئی بزرگ ہونگے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہارِ اسلام کر کے نذر و نیاز چڑھا کر واپس چلا آؤنگا اور پھر کوئی کام کرنے لگونگا۔ اور یہ خیال تھا۔ کہ وہاں اظہارِ اسلام بطور تبرک ہوگا۔

جس روز میں سیالکوٹ سے روانہ ہوا جمعرات تھی۔ میں بٹالہ اسٹیشن سے اتر کر قادیان کے راستہ کی تلاش میں مصروف ہوا اتفاقاً ایک یکّہ قادیان کا مل گیا۔ جس سے دو آنے مقرر کر کے دو اور ہندو سواریوں کے ساتھ میں قادیان پہنچا۔

یکّہ بان غالباً غفارا تھا کشمیری۔ اُس نے مجھے ریتی چھلّا کی طرف جدھر بڈھے شاہ کی دوکانات ہیں اتارا۔ وہ دن جمعہ کا تھا۔ کہ میں دارالامان پہنچا۔ میری شکل و شباہت چونکہ ابھی ہندوآنہ تھی لہذا بازار کے لوگ جب میں اُن سے مرزا صاحب کے مکان کا پتہ دریافت کرتا تعجب کرتے۔ اور مجھے پکڑ کر بٹھا لیتے اور غرض و غائیت اور مقصد دریافت کرنے کے درپے ہو جاتے۔ چنانچہ بڈھے شاہ کی سہ منزلہ دوکانات سے لے کر چوک تک پونچتے پونچتے مجھے دس جگہ روکا گیا ہوگا جہاں سے میں کسی نہ کسی طرح دامن چھڑا کر آگے ہی آگے چلتا گیا۔

سارے ہندو بازار میں چرچا ہو گیا اور جا بجا باتیں ہونے لگیں۔ لوگوں نے مجھے روکنے میں پورا زور صرف کیا۔ اور بعض تو ہاتھ پکڑ کر بیٹھ رہتے تھے مگر میں جان گیا۔ کہ یہ لوگ روکنا چاہتے ہیں۔ آخر زور سے پلّا چھڑا چھڑا کر خدا خدا کر کے چوک میں پہنچا جہاں میاں علی بخش اور نبی بخش دو بھائیوں کی عطاری کی دوکان تھی اُن سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے راستہ بتایا۔ ورنہ ہندو کسی ایک نے بھی مرزا صاحب کے مکان کا راستہ نہ بتایا تھا۔

مسجد مبارک کی کوچہ بندی کے نیچے پہنچکر جہاں اوپر جانے والی سیڑھیوں کے دروازہ کے ساتھ سیڑھیوں کی ڈاٹ کے نیچے ایک چار پائی پر دو شخص بیٹھے تھے۔ ایک قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ اور دوسرے پڑھا رہے تھے۔ جمعہ کی نماز ہو چکی تھی۔

مجھے سید میر حامد شاہ صاحب نے جو خط دیا تھا۔ وہ حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم کے نام تھا۔ مگر مجھے اُن کا حلیہ وغیرہ کوئی نہ بتایا گیا۔ میں نے چار پائی کے برابر پہنچکر السلام علیکم کہا۔ میری آواز پر پڑھانے والے بزرگ نے توجہ کی۔ تو میں نے وہ خط نکالکر اُن کے حوالے کر دیا بغیر اس علم کے کہ وہ صاحب ہیں کون۔ مجھ سے خط لے کر اُس بزرگ نے مجھے سر سے پاؤں تک دو تین مرتبہ گھور گھور کر دیکھا اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

قرآن پڑھانے والے بزرگ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب تھے۔ اور پڑھنے والے میرے محسن بھائی عبدالرحیم صاحب نو مسلم خط پڑھ کر فرمایا۔ میرا ہی نام عبدالکریم ہے۔ اتنے میں موذّن نے اذان کہی اور ہم سب اوپر مسجد مبارک میں چلے گئے۔ اذان حافظ معین الدین صاحب نے کہی جو حافظ معنا کے نام سے مشہور تھے۔ مجھے مولوی صاحب نے وضو کی جگہ بتائی۔ اور خود مسجد مبارک کے درمیانی کمرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھ سے پہلے کوئی صاحب وضو کر رہے تھے۔ اور اس طرح مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ اُن دنوں مسجد مبارک میں جانے کیلئے ایک ہی سیڑھی تھی۔ جو آجتک بھی موجود ہے۔ اور مسجد مبارک کی کوچہ بندی میں جانب غرب اس کا دروازہ کھلا ہے۔ اور یہ تنگ سیڑھی ایک چکر کھا کر مسجد مبارک کے تیسرے حصّہ میں کھلتی تھی۔ سیڑھی کے بائیں جانب ایک غسل خانہ تھا جس میں وضو اور غسل کے لئے پانی رکھا رہتا تھا اور مسجد مبارک کی سطح سے اُن دنوں اُس کی سطح نیچی تھی۔ اور اسی غسل خانہ میں ایک لکڑی کی سیڑھی لگی تھی۔ جس کے ذریعہ گول کمرہ کی چھت پر جاتے۔ اور وہاں سے دوسری سیڑھی کے ذریعہ غسل خانہ کی چھت پر پہنچتے۔ اور مسجد مبارک کی بالائی چھت دو یا تین سٹیپس کے برابر غسل خانہ کی چھت سے بھی اونچی تھی۔ یہ غسل خانہ بعد میں مولوی محمد علی صاحب کیلئے دفتر بن گیا پہلے تخت پوش وغیرہ لگا کر اُس کی چھت اونچی کی گئی۔ مگر بعد میں مستقل طور سے اُسے اونچا کر دیا گیا۔

میں وضو کر کے فارغ ہو کر مسجد مبارک کے درمیانی کمرہ کے دروازہ پر پہنچا (اس زمانہ میں مسجد مبارک کے تین حصّے تھے۔ (۱) حجرہ (۲) درمیانی کمرہ جس میں سے بیت الذکر کو کھڑکی کھلتی ہے۔ اور آج تک موجود ہے۔ سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام ابتدائی ایام میں اسی کھڑکی کے رستہ مسجد مبارک میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور اس کھڑکی کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ صف اوّل کی دائیں طرف کھڑے ہو کر نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس درمیانی کمرہ میں ایک کھڑکی جنوبی جانب بھی ہوا کرتی تھی۔ جس کے نیچے خراس والا شکستہ مکان تھا۔ اور تیسرا کمرہ وہ حصّہ مسجد تھا جس میں نیچے سے آنیوالی سیڑھی کھلتی تھی۔ اور غسل خانہ کا دروازہ بھی اسی میں کھلتا تھا۔ اس تیسرے حصّہ مسجد میں بھی ایک کھڑکی جانب جنوب کھلتی تھی۔ حجرہ میں بھی دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک تو جانب غرب کھلتی تھی۔ جو آجتک بعینہٖ موجود ہے۔ اور دوسری جانب شمال تھی۔ مگر اُس میں اتنا تغیّر سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہی کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ کہ اس میں لوہے کی سلاخیں لگا دی گئیں۔ تاکہ بچوں کے گرنے کا اندیشہ نہ رہے۔

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکان کو جانے کا ایک دروازہ اسی سیڑھی (چھوٹی سی) میں کھلتا تھا۔ جو مسجد مبارک میں داخل ہونے سے ایک دو سیڑھی پہلے ہی جانب شمال لگا ہوا تھا اور آجکل وہ دروازہ تو گو بند ہے۔ اور اس کی بجائے مسجد مبارک میں سے ایک دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ مگر پہلے دروازہ کے آثار بھی (چوکھٹ) ابھی موجود ہیں۔

خراس والی زمین مرزا نظام الدین صاحب وغیرہ کی تھی۔ اُن سے خرید کر اوپر سے مسجد مبارک میں شامل کر لی گئی۔ اور نیچے کے حصہ میں دفتر محاسب وغیرہ بن گئے۔ اور اس تغیّر کی وجہ سے اصل مسجد مبارک کی شکل اگرچہ قائم نہیں رہی مگر دیواروں کے نشان اب تک موجود ہیں۔

میں وضو کے بعد جب دروازہ پر پہنچا۔ تو درمیانی حصّہ میں آٹھ یا دس آدمیوں کا مجمع تھا اور انہی میں سیّدنا حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف فرما تھے۔ مگر میں نے حضور کو نہ پہچانا کیونکہ مجلس میں کوئی امتیاز نہ تھا بلکہ سب کے سب برابر فرش مسجد پر ایک حلقہ کی صورت میں جمع تھے۔

حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے اشارہ سے مجھے آگے بلایا۔ اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی طرف اشارہ کر کے مجھے سلام کرنے کو کہا۔ تب میں نے جانا پہچانا۔ اور ادب سے سلام کیا۔ جس کا سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے جواب دے کر سر اٹھایا اور نیم وا چشم مبارک سے مجھ پر نظر ڈالی۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضورؑ اذان سے پہلے ہی مسجد میں تشریف لے آئے تھے۔ یا کم از کم اذان ہوتے ہی آ گئے تھے۔ (اُس زمانہ میں عموماً حضور اذان سے پہلے مسجد میں تشریف لے آیا کرتے۔ اور بعض اوقات خود حکم دیکر اذان دلوایا کرتے تھے) اور میرے وضو کر کے پہنچنے سے قبل ہی حضرت مولوی عبدالکریم رضؓ صاحب نے حضور سے میرا ذکر کر لیا تھا حضرت مولانا مولوی نورالدین رضؓ صاحب بھی مجلس میں موجود تھے۔

سیّدنا حضرت اقدسؑ نے مجھ پر نظر ڈالی اور فرمایا:۔

"مولوی صاحب! یہ لڑکا تو ابھی بچہ معلوم ہوتا ہے۔ اور نابالغ نظر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو ہندو کوئی فتنہ کھڑا کر دیں۔ یہ لوگ ہمیشہ موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں۔" اس پر حضرت مولانا مولوی عبدالکریم رضؓ صاحب نے ایک طرف مجھے اشارہ کیا۔ اور دوسری طرف حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ لڑکا ہوشیار ہے۔ اور سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہے۔ اور حضرت مولانا مولوی نورالدین رضؓ صاحب نے بھی مولوی صاحب کی تائید میں کوئی ایسی ہی بات

عرض کی۔ ادھر میں خود عرض کرنے کھڑا ہو گیا۔ حضور میں تو مدت ہوئی دل سے مسلمان ہوں۔ نماز مجھے آتی ہے۔ اور پڑھتا ہوں حضور کی کتاب انوار الاسلام اور نشان آسمانی میں نے اچھی طرح سمجھ کر پڑھی ہیں۔ مجھے اسلام کا شوق ہے۔ میں جوان ہوں نابالغ نہیں۔ وغیرہ

اِس پر اللہ تعالےٰ نے میرے آقائے نامدار کو انشراح بخشا۔ اور حضور پر نور نے مجھے قبول فرما کر کلمہ پڑھایا اور داخل اسلام کیا۔ فالحمد للہ، الحمد للہ، الحمد للہ۔ رب توفنی مسلمًا والحقنی بالصالحین

اکتوبر ۱۸۹۵ء کا زمانہ تھا۔ جب میں دارالامان قادیان پہنچا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم سے ہوا۔ میری کسی کوشش یا سعی کو اس میں کوئی بھی دخل نہ تھا۔ میں قادیان کے نام سے بھی ناآشنا تھا۔ اور نہ جانتا تھا کہ قادیان ہے کدھر دو تین ماہ قبل کپور تھلہ سے اپنے سسرال کو جاتے ہوئے بھی میں بٹالہ سے ڈیرہ بابا نانک کو گیا تھا۔ قادیان کا کوئی علم ہوتا تو بھی چلا آتا۔ سسرال جانا میرا اصل مقصد تو تھا نہیں۔ اصل مقصد تو وہی تھا۔ جو خدا نے اب میسّر فرمایا۔

تاریخیں اور مہینے مجھے ٹھیک تو یاد نہیں تخمینہ اور اندازہ سے میں سمجھتا ہوں۔ کہ غالبًا اکتوبر ہی کا مہینہ ہو گا۔ اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ اکتوبر کا ابتداء یا ستمبر کا آخر۔ مگر ۱۸۹۵ء میں تو قطعًا قطعًا کوئی شبہ نہیں۔ فرق ہو گا تو دنوں یا زیادہ سے زیادہ ہفتوں کا ہو گا۔ اور یہ بھی امر یقینی ہے۔ کہ اکتوبر کے ابتداء سے وہ زمانہ کسی حال میں بھی آگے نہیں جاتا۔ کچھ پہلے ہو تو ہو۔

قادیان پہنچکر حضرت اقدس کے دربار میں حاضر ہونے میں جتنی روک مقامی بازار کے ہندو لوگوں کی طرف سے مجھے پیش آئی۔ وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ ایک انسان ایک اجنبی اور نووارد کو روکنے کے جس قدر وسائل اختیار کر سکتا ہے وہ انہوں نے سارے ہی جمع کیئے۔ پیار بھی کیا۔ ہمدردی بھی جتائی۔ خاطر و مدارات بھی کی۔ اور تواضع سے بھی پیش آئے۔ کھانے اور پانی کی تو نہ صرف صلح ہی کی، بلکہ تیار کرانے کو گھروں میں پیغام بھیجدیئے۔ اور آخر جب کام نکلتا نظر نہ آیا۔ تو کچھ سختی بھی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مگر اللہ تعالےٰ نے محض اپنے فضل ہی سے میری دستگیری فرمائی اور دروازہ پر پہنچا کر اندر بھی داخل خود اُسی نے کر دیا۔ ورنہ میں اپنی طاقت سے اُن مشکلات اور روکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے ہرگز ہرگز قابل نہ تھا۔

لوگ کہتے ہیں۔ کہ نالائق نہیں ہوتا قبول
پر میں تو نالائق بھی ہو کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فضل ہے اُسی کا
ورنہ من آنم کہ من میدانم

اے میرے آقا و مالک اور اے میرے ہادی و رہنما!!!
جس طرح تو نے خود اپنے ہاں اپنے ہی ہاتھ سے مجھ ناکارہ انسان، انسان نہیں انسانوں کی بھی عار بلکہ محض ایک کرم خاکی کو بچپن اور کم عمری میں نوازا۔ اور خود میرے دل میں تخم ایمان بو کر اس کی آبیاری فرمائی۔ اسے پودا بنایا۔ اور ہر قسم کی باد صرصر اور مخالف ہواؤں سے محفوظ رکھتے ہوئے وحوش اور درندوں کی پامالی سے بچا کر اِس **باغ احمد** میں پہنچایا اور اس گلستان میں اپنے محض فضل سے ایسی جگہ دلائی۔ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ اور جہاں میرے خواب و خیال کو بھی رسائی نہ تھی۔ اے میرے پیارے اور میری جان کی جان!!

جس طرح یہ سب کچھ آپ نے خود کیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر آئندہ بھی میرے ساتھ معاملہ فرمائیو۔ اور طرفۃ العین کے لئے بھی مجھے میرے نفس کے سپرد نہ کریو۔ بلکہ میرا کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا، میرا اٹھنا اور بیٹھنا، خلاصہ یہ کہ میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ ہی آپ اپنی رضا کے مطابق کر دیں۔

اے حیّ و قیوم و قدیر تیری عطاؤں کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جیسا کہ جسے تو رد کر دے کوئی بچانے والا بھی نہیں۔ میں تجھے تیری کبریائی، عظمت و جبروت کا واسطہ دیکر پکارتا ہوں۔ اور تیرے آستانہ پر گر کر التجا کرتا ہوں۔ کہ مجھے ایک خاک آلودہ بیج کی طرح اپنی ربوبیت کی طفیل اتنا بڑھا۔ پھیلا اور پھلدار بنا۔ کہ نسلیں اور قومیں میرے سایہ تلے آرام پائیں۔ تیری ہر قسم کی مخلوق میرے بار و بر سے مستفیض ہو۔ میرے اثمار اور میرے پھلوں میں اپنے کرم سے ایسی شیرینی، لطافت اور نفاست بھر دے۔ کہ دنیا اُن کی طلبگار ہو۔ اور ان کو پا کر سیری حاصل کرے اور روحانی حاجات، اور جسمانی ضروریات میں وہ حاجتمندوں کی مراد بنیں۔

اے قادر و توانا! تیرے لئے کوئی کام انہونا نہیں۔ ناممکن کا لفظ تیری قدرت کے مقابل میں غلط محض ہے۔ اور تیرے حرف ایک "کُنْ" میں دنیا جہان کے سارے کام ہو سکتے ہیں۔ اپنی خاص قدرت نمائی فرما اور میری ساری اولاد (لڑکے اور لڑکیاں، نواسے اور پوتے پوتیاں، داماد اور بہوئیں، ان کی نسلیں اور نسلوں کی نسلیں، پشتوں تک) میں ایسا خارق عادت تغیر پیدا کر دے۔ اور اُن کو نیک متقی اور پارسا بنا۔ کہ وہ تیری قدوسیت و سبّوحیّت، تیری رحمانیت رحیمیت اور ربوبیّت اور ساری ہی صفات کے مظہر کامل ہو جائیں۔ اور تجھ میں ایسے فناہ ہوں کہ تیری مرضی اور رضاء کے سوا اُن کا اپنا کچھ بھی باقی نہ رہ جائے وہ حقیقی معنوں میں تیرے بندے اور تو ان کا حقیقی خدا ہو۔

اے ستّار و غفّار ہستی! میری پردہ پوشی فرما۔ اور میرے گناہوں اور معاصی کو معاف فرما۔ اور ایسا ہو کہ میری کوئی غلطی، معصیّت یا گناہ میری دعاؤں کی قبولیت میں روک نہ بن سکے۔

اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! میں تجھ سے تیری تمام صفات کاملہ کے صدقے یہ التجا کرتا ہوں۔ کہ جس در سے تو نے مجھ پر اپنی چہرہ نمائی فرمائی۔ اس کو ہمیشہ ہمیش مجھ پر اور میری اولاد پر وا رکھیو۔ اور ہمیں اس خاندان کی غلامی کی عزت و سعادت سے کبھی بھی محروم نہ کریو۔ اور سچی وفاداری۔ اور نیازمندی اور خدمتگذاری کے شرف سے مشرف فرمائے رکھیو۔ اے سارے فضلوں کے مالک ہم خالی ہاتھ ہیں۔ کسی عمل پر بھروسہ نہیں۔ نجات تیرے فضل سے وابستہ ہے۔ تیری اسی صفت کے طفیل تجھ سے بغیر حساب پار اتارا جاتا ہے۔

اے سارے پاکباز اور مقدسین کے خدا! اے انبیاء و مرسلین اور سیدالکونینؐ خاتم المرسلینؐ کے آقا! اے اس نبیؐ آخرالزماں اور خاتم النبیّنؐ کے بروز کامل مظہر اتم کے ربّ! ان تمام پاکباز مقدسین پر اور اُن کے سارے ہی غلاموں پر امتوں پر اُن کے خلفاء اور ازواج گذر چکے یا موجود ہیں یا آئندہ ہونگے ہزاروں ہزار رحمتیں نازل فرما۔ درود پہنچا اور اپنے بے انتہا افضال و برکات سے اُن سب کو بہرہ ور فرما کر لا انتہا مدارج عطا فرما۔ اور ان مقدسین کے طفیل مجھ ناکارہ اور درماندہ کی پکار سُن لے مجھے سموچا اپنا بنا لے۔ اور تو میرا ہو جا۔ میری نسلوں میں ایسی برکت دے کہ گنی نہ جائیں۔ اور اُن میں ایسی نیکی اور پاکیزگی بھر دے۔ کہ قابل رشک بن کر ہمیشہ خدانما رہیں۔ اور تیرے شعائر بن جائیں۔ تا کوئی یہ نہ کہ سکے۔ کہ تیرے ہاں تیرے اپنے ہاتھ کا لگایا ہوا پودہ بے برگ و بار رہ گیا۔

اے ہمارے خدا! اے علیم و بصیر ہستی!! تیرا پاک دین اسلام اسوقت دنیا میں نہائت ہی بے کسی اور کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔ کہ نزع اور جان کنی میں پڑا ہے۔ بیگانے تو درکنار خود اپنے بھی دشمن بن گئے ہیں۔ تیرے مقدسین اور راستبازوں کی توہین کی جاتی ہے۔ اور اعلانیہ اُن کے نام پر گند اچھالا جاتا ہے۔ اور ان معصوموں پر دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف سے تیر برسائے جاتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں جو بھی تیرے دین کی حمائت یا تیرے مقدسین کی برأت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کے کیڑے اور ظلمت کے فرزند کیا اپنے اور کیا پرائے سبھی ان پر پل پڑتے ہیں۔ اور ایک جان ہو کر ایک ہی کمان سے تیر برسانے لگ جاتے ہیں۔

ہمارے آقا! تو خود آ۔ اور اس غریب کو دشمنوں کے نرغے سے نکال۔ اس کی حفاظت فرما۔ اور دلربیت کر۔ تا وہی پہلی سی تازگی، شادابی اور ملاحت اس میں پیدا ہو اس کی خزان کو بہار سے بدل دے۔ اور اس کا خوبصورت چہرہ دکھا کر پھر دنیا کو اس کی گود میں جمع کر دے۔ تا اس کی برتری دنیا پر ظاہر ہو۔ دنیا کی آنکھیں کھول۔ کہ اس نور سے اپنی آنکھوں کو نورانی کریں۔ اور اس آب حیات سے اپنی تشنگی دور کر کے ابدی زندگی اور جاودانی حیات کے وارث ٹھہریں۔ اٰمین اللّٰھمّ اٰمین ثمّ اٰمین

غرض اس طرح اللہ تعالےٰ نے مجھ ناچیز کو کفر و شرک کے اتھاہ گڑھے سے اپنا دست قدرت بڑھا کر نکالا۔ اور اپنے پیارے مسیحؑ کے ذریعہ مجھے قبول فرما لیا۔ میں قادیان میں رہنے لگا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب (نو مسلم)، جو مجھ سے چھ سات ماہ قبل قادیان پہنچ چکے تھے کے دل میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جگہ بنا دی۔ اور وہ میری ہر طرح کی نگرانی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنے لگے جزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرۃ

شیخ عبدالعزیز صاحب (نو مسلم) جو علاقہ ریاست جموں کے باشندے تھے۔ مجھ سے قریباً دو ہفتہ قبل قادیان میں آچکے تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ تعلق محبت رکھتے اور مل جل کر رہتے تھے۔

اس زمانہ میں صرف چند لوگ قادیان میں رہتے تھے اور باہر سے آنے والوں میں عموماً حضرت مفتی محمد صادق صاحب مرزا ایوب بیگ صاحب مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مرزا یعقوب بیگ صاحب اور کپورتھلہ کی جماعت کے بعض پرانے بزرگ ایسے ہیں۔ جن کے متعلق بخوبی یاد ہے۔ کہ اکثر آتے رہتے تھے۔ مگر سلسلہ آمد مہمانان بہت ہی کم اور محدود تھا۔

لنگر خانہ اس زمانہ میں اُس حصۂ مکان میں تھا۔ جہاں آجکل حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ثانی ایدہ اللہ کے حرم اوّل کی ڈیوڑھی ہے۔ اور وہ حصہ سارے کا سارا خام عمارت تھی۔ کھانا صبح کے وقت گول کمرہ میں اور شام کو مسجد مبارک کی بالائی منزل پر بعد نماز شام کھلایا جاتا تھا۔ اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام خود بھی شرکت فرماتے تھے۔ مسجد مبارک کی بالائی منزل پر دو شہ نشین تھے، ایک تو جنوبی آثار کے اوپر جیسا کہ آجکل بھی ہے۔ مگر سیخ وغیرہ نہ تھیں۔ اور دوسرا مسجد کے حجرہ کے اوپر کی غربی دیوار کے آثار پر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام عموماً نماز شام کے بعد اسی شہ نشین پر رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ جو حجرہ کے غربی آثار پر بنا ہوا تھا۔

گول کمرہ کا صرف وہی حصہ تھا۔ جو گول کمرہ کی صورت میں مسقف ہے۔ اگلے حصہ کی چار دیواری بعد میں بنائی گئی۔ اور اور اب جہاں گول کمرہ کا صحن ہے۔ یہ حصہ پہلے بالکل کھلا اور میدان میں شامل تھا۔ کھانا اس زمانہ میں ملک غلام حسین صاحب پکاتے تھے۔ اور ابتداء میں چپاتیاں ہوا کرتی تھیں جو غالباً گھر کے اندر ہی خادمات پکاتی تھیں۔ تنور کی روٹی بعد میں شروع ہوئی۔ کھانے میں عموماً دال اور کبھی کبھی سبزی گوشت، بعض اوقات ایک وقت دال دوسرے وقت سالن ہوتا تھا۔ دال عموماً چنے کی ایسی پتلی مگر ایسی لذیذ کہ پیالہ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پی جایا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلے پہلے عام دسترخوان ہی پر شمولیت فرمایا کرتے تھے حضورؑ نہائت ہی کم کھاتے۔ چپاتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتے ننھا سا حصہ لے کر انگلیوں میں رول رول کر بعض اوقات اس میں سے بھی بعض حصہ الگ کر دیتے۔ اور کچھ کھایا کرتے ایسا معلوم ہوا کرتا تھا۔ کہ حضور محض شمولیت کی غرض سے تشریف فرما ہیں۔ اور دوسروں کو کھلا رہے ہیں۔ خود محض برائے نام نوش فرماتے تھے۔ حضور کے سامنے اگر کوئی خاص چیز آتی۔ حضور اُسے تقسیم فرما دیا کرتے تھے دسترخوان پر باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

ایک وقت آیا۔ کہ بعض ناگوار واقعات کی وجہ سے حضور نے عام دسترخوان پر تشریف لانا بند کر دیا۔ اور اس طرح دو دسترخوان الگ الگ ہو گئے۔ اور حضور بعض خاص اصحاب اور مہمانوں کے ساتھ تناول فرمانے لگے۔ اور ہوتے ہوتے ایسا ہوا۔ کہ حضور صرف شام کے دسترخوان پہ شرکت فرمایا کرتے۔

مَیں قادیان میں رہنے لگا۔ قرآن شریف بھائی عبدالرحیم صاحب نے پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ سیدنا حضرت اقدسؑ کی بعض کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جن میں سے سرمہ چشم آریہ سب سے پہلے میں نے پڑھی۔ جو مرزا ایوب بیگ صاحب مرحوم نے مجھے ایک حد تک پڑھائی اور سمجھائی۔ مرحوم مجھ سے بہت سلوک اور محبت کرتے تھے۔

قادیان کی پُر لطف زندگی اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت اور حضور کے چہرہ مبارک کی محبت نے میرے دل سے واپسی کے خیالات بالکل ہی نکال دیئے۔ اور میں نے اظہار اسلام کر کے باہر چلے جانے کی بجائے اسی زندگی کو ترجیح دے لی۔ اور فیصلہ کر لیا۔ کہ اب جینا مرنا یہیں ہو تو خوشی ہے۔

میرا سامان جو کچھ بھی تھا۔ سیالکوٹ ہی میں رکھا تھا۔ میں نے چاہا۔ کہ ایک مرتبہ سیالکوٹ جاؤں۔ سامان بھی لے آؤں اور سید بشیر حیدر صاحب سے ملاقات بھی کر آؤں۔ چنانچہ میں نے اسی نیت کا اظہار حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم سے کر کے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر حضرت مولوی صاحب نے بجائے اس کے کہ میرے لئے اجازت حاصل کرتے خود ہی فرمایا۔ کہ "سیالکوٹ جانے کی ضرورت نہیں، سامان ہم یہیں منگا لیتے ہیں۔ اور بشیر حیدر بھی خود آکر مل جائیگا۔"

"بہت اچھا جسطرح آپ فرماتے ہیں یہی ٹھیک ہے" یہ میرا جواب تھا۔ جس سے حضرت مولوی صاحب خوش ہوئے اور مجھے دعا دی۔ اور سامان کے واسطے اسی روز خط لکھ دیا۔ جو نہیں معلوم کسی آنے والے کے ہاتھ یا پارسل ہو کر جلدی آگیا۔ اور مجھے مل گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سید بشیر حیدر صاحب بھی آئے اور مل گئے۔

میں کچھ شرمیلا زیادہ تھا جس کی وجہ سے زیادہ میل جول کا عادی نہ تھا۔ تنہائی مجھے زیادہ اچھی لگتی۔ اسی وجہ سے میرا حلقۂ تعارف بہت محدود رہتا۔ اور جن سے کسی مناسبت کی وجہ سے تعلق ہو گیا۔ انہی کے ساتھ مل جل لیا کرتا تھا۔ نمازوں اور درس حضرت مولانا نور الدینؓ صاحب میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتا۔ اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی صحبت مسجد اور ہمرکابی سیر کو اپنی نہائت ہی مرغوب چیز یقین کرتا۔ نماز حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب پڑھایا کرتے۔ جن کی قرآن خوانی کا میں عاشق تھا۔ اُن کی قرأت میں ایسا سوز و گداز ہوا کرتا تھا۔ کہ رقت پیدا ہو جایا کرتی۔ صبح کی نماز کی قرأت سے غفلت کی نیند سونے والے جاگ اٹھا کرتے۔ اور جن کی نیند کو مؤذن کی اذان کھول نہ سکتی۔ اس قرأت کی سُریلی آواز سے چونک کھڑے ہوا کرتے تھے۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں دو اڑھائی یا تین مہینے کے قریب زمانہ قادیان میں رہتے ہوئے ہوگا۔ اور اگرچہ میری رہائش بالکل مسافرانہ تھی۔ کیونکہ کوئی گھر تھا نہ گھاٹ ایک الماری حضرت مولانا مولوی نور الدینؓ صاحب کے مطب میں مجھے ملی ہوئی تھی۔ وہی میرا گھر تھا۔ تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ اور خوراک و پوشاک اور دوسری ضروریات کا بھی خدائے واحد و یگانہ کے سوا کوئی کفیل نہ تھا۔ گھر سے یا بڑے چچا صاحب سے جو کچھ لایا تھا۔ ابھی اُسی پر گذارہ ہوتا تھا۔ مگر باوجود ان باتوں کے میرا دل اپنے وطن اور ماں باپ کے گھر سے زیادہ مطمئن اور بہت زیادہ خوش تھا۔ اور قادیان سے باہر جانے کا وہم بھی مجھے اُس وقت نہ آیا تھا۔

سکھوں میں تبلیغ کی طرف سیدنا حضرت اقدس عمؑ کی توجہ اس زمانہ میں خاص طور سے تھی۔ اور حضورؑ کتاب "ست بچن" تصنیف فرما رہے تھے۔ جس کے واسطے مصالحہ جمع کرنے کیلئے سکھوں کی کتب کی چھان بین ہو رہی تھی۔ اور اسی ذیل میں حضور کو ڈیرہ بابا نانک چولا صاحب دیکھنے کی غرض سے جانا پڑا۔ اس زمانہ میں سواری یکوں ہی کی ہوا کرتی تھی۔ بڑی کوشش اور انتظام سے دو یا تین یکے تیار کرائے گئے۔ اور سفر کی تیاری ہوئی ساتھیوں کے نام تجویز ہونے لگے میرا نام بھی پیش ہوا۔ مگر حضور پاک نے فرمایا۔ "ان کے گاؤں کا قرب ہے ایسا نہ ہو کوئی رشتہ داران کو دیکھ کر پیچھے پڑ جائے اور ہمارے سفر کی غرض ہی فوت ہو جائے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ نہ جائیں۔"

چنانچہ اس طرح میں اس مبارک سفر میں ہمرکابی کے شرف سے محروم رہ گیا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب ہمرکاب تھے۔

اس سفر سے واپسی پر سیدنا حضرت اقدسؑ بہت ہی خوش تھے۔ اور اس تبلیغی دریافت کا ذکر اس طرح مجلس میں فرمایا کرتے جس طرح کوئی دنیا دار کسی بھاری خزانہ کے حصول سے خوش ہو۔ چنانچہ اکثر ایسے ہی مسائل کا چرچہ ان دنوں ہوا کرتا تھا۔ اور قادیان کے دن اور رات، تنہائی اور مجالس تبلیغی جد و جہد اور روحانی خزائن کی دریافت و اشاعت کیلئے ہی وقف رہتے تھے۔

اُسی زمانہ کا ذکر ہے۔ ایک رات (موسم سردی کا یاد پڑتا ہے کیونکہ مطب کے اندر سویا ہوا تھا۔ اور صبح کی اپنی کیفیت کے مدنظر بھی یہی اندازہ کرتا ہوں کہ خاص سردی کے ایام تھے) میں مطب میں سویا ہوا تھا۔ اور میرے قریب مرزا محمد اشرف صاحب افسر جائیداد (موجودہ سنہ ۱۹۳۸ء) کے والد بزرگوار مولوی جلال الدین صاحب مرحوم جو ایک نہائت ہی نیک، ولی، پاک نفس اور عبادت گذار انسان تھے۔ اور انہیں کی تبلیغ اور صحبت میں بھائی عبدالرحیم صاحب مسلمان ہوئے تھے۔ میرے قریب ہی ان کی چارپائی تھی۔ وہ چارپائی ہی پر نماز تہجد ادا کر رہے تھے۔ اس رات اُسی وقت میں نے ایک منذر رؤیا دیکھی۔ جس کے اثر سے میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور میری اس گھبراہٹ کا اثر ایسا ظاہر تھا۔

کہ مولوی صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا "کیوں میاں عبدالرحمٰن! کیا بات ہے ؟" میں نے اصل بات بتائے بغیر ہی عرض کیا۔ "خیر ہے۔ نماز کے لئے اٹھا ہوں"۔

"خواب میں مجھے دکھایا گیا۔ کہ ایک باریک لمبا سانپ میری طرف آرہا ہے۔ اور جب وہ میرے قریب آیا تو حضرت مولانا مولوی نورالدین رضی اللہ عنہ صاحب نے ایک لاٹھی اس کو ماری مگر وہ لاٹھی کے نیچے سے بالکل صفائی کے ساتھ زندہ نکل کر سیدھا میری طرف بڑھا۔ اور میرے جسم کے گرد لپٹ گیا۔" اس نظارہ اور سانپ کے میرے جسم کے گرد لپٹ جانے کی وجہ سے مجھ پر ایسی گھبراہٹ اور پریشانی وارد ہوئی۔ کہ میں نیند سے ایسا چونک کر اٹھا کہ مولوی صاحب موصوف نے بھی میری بیداری کو غیر معمولی گھبراہٹ زدہ محسوس کیا۔

اٹھا۔ استغفار کیا۔ اور وضو کرکے دو چار نفل پڑھے ہونگے۔ کہ صبح کی اذان ہوگئی۔ مسجد پہنچا۔ صبح کی نماز ادا کی۔ اور واپس آکر اپنا قرآن شریف جو کہ حضرت اقدسؑ کے کتب خانہ میں پیرجی سراج الحق صاحب کے پاس (مطب کے شمال مشرقی کونہ کی کوٹھڑی) رکھا تھا۔ لیکر اپنی چٹائی اٹھانے کو تھا۔ تا مطب کے اوپر چھت پر جاکر تلاوت کروں۔ کہ پیرجی سراج الحق صاحب نعمانی مجھ سے فرمانے لگے۔ "میاں عبدالرحمٰن! ہمارا ایک کام تو کردو۔ اور ساتھ ہی ایک منی آرڈر فارم اور کچھ روپے دیکر فرمایا۔ یہ منی آرڈر کرا آؤ۔" مجھے پیر صاحب کا یہ ارشاد اسوقت جبکہ میں تلاوت قرآن کریم کی غرض سے جارہا تھا۔ کچھ گراں اور ناگوار بھی گزرا مگر اس خیال سے کہ ایک بزرگ کے ارشاد کی تعمیل بھی تو نیکی ہے۔ قرآن شریف واپس اندر رکھ کر منی آرڈر کرانے بازار کو چلا گیا۔ اسوقت مجھے خوب یاد ہے۔ کہ میں نے ایک دوتہی اوڑھی ہوئی تھی۔ جس سے یقیناً سردی کا موسم معلوم ہوتا ہے۔

پوسٹ آفس اس زمانہ میں لالہ بڈھامل کی دو منزلہ دوکان کے نچلے حصہ میں ایک آریہ سکول ماسٹر مسمی سومراج کے ہاتھ میں ہوا کرتا تھا۔ لالہ بڈھامل کی دو عمارتیں بالمقابل اونچی اونچی پہاڑی دروازہ کے قریب کھڑی ہیں۔ جو ریتی چھلا نام میدان کی طرف ہے۔ اور پوسٹ آفس مشرقی جانب کی دوکان میں تھا۔ اور صبح سویرے ہی سویرے سکول جانے سے پہلے وہ ماسٹر ڈاک روانہ کردیا کرتا تھا۔

میں منی آرڈر کو لے کر جلد جلد ہندو بازار سے ہوتا ہوا ڈاک خانہ کو گیا۔ تاکہ واپس آکر تلاوت کروں۔ مگر جب میں ڈاکخانہ پہنچا۔ اور اُس کے کھلے دروازہ کے سامنے کھڑا ہوا۔ تو دیکھتا ہوں۔ کہ میرے والد صاحب اس آریہ ماسٹر کے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ میں اس نظارہ سے جو اچانک پیش آیا۔ ایک سکتے کے عالم میں تھا۔ اور طبیعت نے ابھی فیصلہ نہ کیا تھا۔ کہ قدم آگے اٹھاؤں یا پیچھے کہ والد صاحب مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو کر میری طرف بڑھے۔ اور مجھ سے لپٹ گئے۔ چھاتی سے لگایا۔ اور پیار کیا۔ اور میری تسلی کے لئے فرمانے لگے۔ "بیٹا! تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ جب تمہارے دل کو یہی بات پسند ہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ خوش رہو۔ اور جہاں چاہو رہو۔ مگر تم گھر سے آئے پھر اطلاع نہ دی ہم لوگ تمہاری تلاش میں سرگرداں پھرے سینکڑوں روپیہ برباد ہوا۔ تمہاری ماں روتے روتے اندھی ہوگئی۔ اور تمہارے عزیز بھائی بہنیں جدائی کی وجہ سے بیتاب اور نیم جان ہیں۔ ایک مرتبہ چل کر ماں کو مل لو شائد اس کی بینائی بچ جائے۔ اور بھائی بہنوں کو پیار کرلو۔ کہ وہ تمہارے نام کو ترستے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ

والد صاحب جیسا کہ شائد میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ بہت ہوشیار انسان تھے۔ اس زمانہ کے مناسب حال فارسی زبان اور اردو میں ان کو خاص مہارت تھی۔ اور بہت اچھے منشی بلکہ خوشنویس اور انشا پرداز بھی تھے۔ بعد کے حالات سے معلوم ہوا۔ کہ والد صاحب قادیان میں ایک روز قبل کے آئے ہوئے تھے۔ اور مقامی ہندوؤں اور آریوں سے (جن میں سے سب سے زیادہ ڈپٹیوں کا گھرانہ جن کا مکان اُن دنوں اللہ پاک کی عجیب در عجیب قدرت نمائی کا نمونہ ہوکر صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کی صورت میں کھڑا ہے۔ اور یہی مدرس غالباً سومراج) مشورے اور منصوبے گانٹھتے رہے تھے۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ یہاں تک بھی فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ اگر اور کوئی صورت نہ بنی۔ تو رات کے اندھیرے میں سوتے کی چارپائی اٹھوا لائیں گے۔ کوئی ہمارا مقابلہ نہ کرسکیگا میں اچانک والد صاحب کی گرفت میں آجانے کی وجہ سے ابھی پریشان اور بالکل خاموش تھا۔ چند منٹ بعد سنبھلا تو عرض کیا۔ چلیں حضرت صاحب کے ڈیرے کی طرف تشریف لے چلیں اور ساتھ ہی پوسٹماسٹر کو جلدی منی آرڈر کرنے کو کہا۔ مگر وہ ٹراشریر آدمی تھا۔ اُس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دوسرے کام شروع کر دیئے اور میرا منی آرڈر پیچھے اٹھا رکھا اُس کی غرض یہ تھی کہ میرے والد صاحب اچھی طرح سے باتیں کرلیں۔ کیونکہ عین ممکن تھا۔ کہ اس کے خیال کے مطابق میرے والد صاحب کو پھر مجھ سے اسطرح باتیں کرنے کا موقع نہ ملے

غرض اس طرح چند منٹ اور دیر ہوئی۔ اور میں والد صاحب کے پاس بیٹھا اُن کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور والد صاحب بھی مصلحت وقت کے ماتحت اُس وقت نہائت ہی محبت شفقت اور ہمدردی کی باتیں کرتے رہے اور ایسے واقعات سناتے رہے۔ جن سے میرا دل پگھلے اور نرم ہو۔ اور والدہ اور بھائی بہنوں کی محبت میرے سینے میں جوش مار کر تازہ ہو۔

نہ معلوم کس طرح کسی اپنے یا بیگانے کے ذریعہ ہمارے ڈیرے میں یہ بات جا پہنچی۔ کہ "عبدالرحمٰن کو اس کے والد اور ہندوؤں نے پکڑ لیا ہے۔ اور ڈاکخانہ کے اندر روک رکھا ہے۔" یہ افواہ ڈیرے میں پہنچی اور فوراً ہی کسی نے اندر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام تک بھی پہنچا دی جس کے سنتے ہی حضور پاک فداہ روحی حرم سرا سے باہر تشریف لے آئے۔ اور نہ معلوم حضور کی اجازت سے یا خود بخود ہی جس دوست نے جو اُن دنوں قادیان میں موجود تھے سنا۔ ڈاک خانہ کو روانہ ہوگیا۔ اور ڈیرے سے ڈاکخانہ تک موجود الوقت بزرگان سلسلہ کا ایک تانتا بندھ گیا۔

استنے میں پوسٹماسٹر نے بھی مجھے فارغ کر دیا تھا۔ اور میں نے والد صاحب کو حضرت اقدسؑ کی خدمت میں حاضر ہونے پر رضامند کرلیا تھا۔ چنانچہ والد صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ اور میں بازار میں اتر چکا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت نانا جان صاحب مرحوم رضی اللہ عنہ، پیرجی سراج الحق صاحب رضی اللہ عنہ نعمانی بھائی عبدالرحیم صاحب۔ بھائی عبدالعزیز صاحب اور اور بہت سے دوست جن کے اسماء اور اُن کا خیال مرور زمانہ کی وجہ سے ذہن سے اُتر گیا ہے۔ چلے آرہے ہیں۔ کوئی آگے ہے کوئی پیچھے کوئی تیز آرہا ہے۔ اور کوئی دوڑ کر۔ اس سچی محبت، حقیقی اخلاص اور دلی ہمدردی کا اثر میرے قلب سے آجتک کبھی زائل نہیں ہوا۔ جو اس واقعہ کی اطلاع سے ان بزرگوں میں میرے لئے پیدا ہوا تھا۔

میں والد صاحب کو لیکر بازار سے ڈیرے کو روانہ ہوا۔ میرے محسن مہربان شفیق اور دوست بھی میرے ساتھ ہی واپس لوٹے اور بازار کے ہندوؤں کو تو علم تھا ہی۔ وہ اس نظارہ کا معائنہ کرنے دوکانوں پر کھڑے ہو گئے۔ اور اس طرح ایک بھیڑ اس اُجڑے بازار میں نظر آنے لگی۔

مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میرے واجب الاحترام بزرگ قابل عزت بھائی۔ اور مہربان دوست خود بخود میرے پکڑے جانے کی اطلاع پاکر میری طرف ڈاکخانہ کو روانہ ہو گئے تھے۔ یا کہ اُن کو سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کوئی حکم پہنچا تھا جس کی تعمیل میں بڑے بڑے بزرگ مجھ ناکارہ و ناچیز کی امداد کو روانہ ہو گئے تھے۔ (مجھے ان بزرگوں میں سے بعض کے نام یاد نہیں رہے۔ پہلے چند نام لکھے ہیں۔ اُن میں مخدومی مخترم حضرت حاجی حافظ حکیم فضل الدین صاحب مرحوم و مغفور کا نام نامی بھی قابل اندراج ہے)

مسجد مبارک کی کوچہ بندی سے نکلتے ہی میری نظر میرے آقائے نامدار فداہ روحی سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پڑی جبکہ حضور ؑ فصیل کی پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے (آج کل احمدیہ چوک کے جانب شرق جو مکان حضرت اقدس کے موٹر گراج کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اُس سے قبل رتھ خانہ تھا۔ اور جس کے اوپر پیرجی سراج الحق صاحب کے مکان کا صحن واقعہ ہے۔ یہ جگہ پہلے پہل ۱۸۹۵ء میں ایک کھلے دالان کی صورت میں تھا۔ اور بعد میں اسمیں ضیاء الاسلام پریس سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے قائم کیا گیا۔ اس دلان کے جانب جنوب سے لے کر موجودہ مہمان خانہ تک (مہمان خانہ کی شکل بھی اب بدل چکی ہے۔ شرق کی جانب بھی وسیع ہوگیا ہے۔ اور جانب شمال بھی ایک دلان اور بڑھ گیا ہے۔ پہلے صرف پچھلی دو کوٹھڑیاں ہوا کرتی تھیں۔) مسلسل ایک پلیٹ فارم تھا جو دراصل شکستہ شہر پناہ یا فصیل تھی۔

یہ پلیٹ فارم قریباً ۲۲ فٹ چوڑا اور ایک سو دس فٹ لمبا تھا) حضورؑ پاک کو دیکھ کر میرے دل میں جذبات محبت و شکر گذاری کا ایک سمندر موجزن ہو گیا۔ اور اس طرح اچانک پکڑے جانے کا جو صدمہ اور افسردگی میرے دل پر مستولی تھی۔ دور ہو کر بشاشت خوشی اور اطمینان مل گیا۔ اور میں نے والد صاحب کو دور ہی سے بتا دیا۔ کہ وہ ہمارے حضرتؑ صاحب ہیں۔

والد صاحب ہوشیار آدمی تھے۔ اشارہ پاتے ہی سنبھل گئے۔ اور نہائت مؤدبانہ و نیازمندانہ رفتار اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر مٹھی میں لے لئے۔ قریب پہنچکر ہندوآنہ سلام کر کے نذرانہ پیش کیا حضورؑ نے سلام کا جواب تو دیا۔ مگر نذرانہ قبول نہ فرمایا۔ اور باوجود والد صاحب کے اصرار کے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ حضورؑ نے نہائت شفقت اور مہربانی سے اوّل خیریت پوچھی۔ اور پھر آمد کا مقصد و غائت دریافت فرمائی۔ اور ایسے طریق سے حضورؑ نے کلام فرمایا۔ کہ میرے والد صاحب کا سہما ہوا دل اور مرجھایا ہوا چہرہ بشاش ہو گیا۔ اور اس طرح وہ کھل کر عرض حال کرنے کے قابل ہو گئے۔ نہ معلوم اُن کے دل میں کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ جبکہ وہ تنہا میرے ساتھ ہمارے ڈیرہ کی طرف آ رہے تھے۔ اور اُن کے حمائتی منصوبہ باز اور سازشی لوگوں میں سے کوئی بھی اُن کے ساتھ نہ ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ چاروں طرف میرے محسنوں، بزرگوں، دوستوں اور بھائیوں کا ہجوم دیکھتے آ رہے تھے۔ حضور کی محبت و شفقت اور نرمی و پاکیزہ اخلاق نے اُن کی کمر ہمّت باندھ دی۔ اور اس طرح وہ آزادانہ طور پر اپنا مقصد اور دلی غرض و غائیت حضرت اقدسؑ کے حضور پیش کر سکے۔

قریباً نصف گھنٹہ تک حضورؑ نے اُن کے معروضات نہائت توجہ سے سُنے۔ اور دورانِ گفتگو میں حضورؑ اس پلیٹ فارم پر شمالاً جنوباً ٹہلتے رہے۔ کہیں کہیں حضورؑ اُن کی دلجوئی اور تسلّی کے لئے بعض ناصحانہ فقرات فرماتے اور بعض غلط خیالات کا ازالہ بھی فرماتے رہے جب میرے والد صاحب دل کھول کر سب کچھ عرض کر چکے۔ تو سیّدنا حضرت اقدسؑ نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا۔ "میاں عبدالرحمٰن تمہاری کیا مرضی ہے؟"

چونکہ والد صاحب کے ساتھ میں بھی حضرتؑ کے ساتھ ساتھ ٹہلتا اور تمام باتیں سنتا رہا تھا۔ اور اُن کی غرض و غائت اور مقصود کا مجھے علم ہو چکا تھا۔ میں نے نہائت ادب سے حضرتؑ کے حضور عرض کیا۔

"حضور میں دل سے مسلمان ہوں۔ اور حضور کی غلامی کی سعادت اللہ پاک نے مجھے محض اپنے فضل سے بخشدی ہے۔ بے شک والدین اور بھائی بہنوں کی محبت میرے دل میں بیحد ہے۔ مگر میں ابھی جانا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں نے اسلام کے متعلق کچھ بھی نہیں سیکھا۔"

میری یہ عرض سنکر حضورؑ نے میرے والد صاحب کو بلا کر فرمایا:۔

"ہم ابھی عبدالرحمٰن کو آپ کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔ بہتر ہے۔ کہ آپ کو اگر فرصت ہو۔ تو ہفتہ دو ہفتہ ان کے پاس ٹھہریں۔ اور اگر آپ ملازمت کی وجہ سے نہ ٹھہر سکیں تو اِن کی والدہ اور بھائی بہنوں کو یہاں بھیجدیں۔ وہ اِن کے پاس جتنا عرصہ چاہیں ٹھہریں۔ اُن کی آمد و رفت اور بود و باش کے اخراجات ہمارے ذمہ ہونگے"

حضور یہ جواب دیکر اندر تشریف لے گئے۔ اور میں والد صاحب کو ساتھ لیکر سیدنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدین صاحب کے مطب میں جا بیٹھا جہاں اُن دنوں حضور کی کتاب "ست بچن" کی فرمہ شکنی اور مسل برداری ہو رہی تھی۔ والد صاحب کے دل پر حضور کے اس فیصلہ کی وجہ سے رنج و غم کا غلبہ تھا۔ اور اُن کی دلی مایوسی کا اثر اُن کے چہرہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ مگر میں خوش تھا۔ اور والد صاحب کو بھی خوش کرنا چاہتا تھا کبھی ست بچن میں سے بابا نانک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے متعلق نظم پڑھ کر سناتا۔ کبھی کسی اور طریق سے اُن کی خدمت کر کے اُن کی دلجوئی کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر بعد ایک ہندو آیا۔ اور کھانے کے لئے والد صاحب کو ساتھ لے گیا۔

سیّدنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدین صاحبؓ کا مطب اس زمانہ میں یہی دالان تھا۔ جو موجودہ موٹر گیراج کے جانب شمال واقع ہے۔ مگر یہ مطب پہلے صرف ایک لمبے دالان کی صورت میں تھا۔ جس کے جانب شمال دو کوٹھڑیاں تھیں۔ جن کے دروازے جانب جنوب اُس دالان میں کھلتے تھے۔ شرقی کوٹھڑی میں سیدنا حضرت اقدسؑ مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کتب خانہ ہوا کرتا تھا جس کے انچارج اُس زمانہ میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں حضرت پیر جی سراج الحق صاحب نعمانی تھے۔ اور دوسرے غربی جانب کی کوٹھڑی عموماً کھلی رہتی۔ اور مسافروں یا مہمانوں کے کام آیا کرتی تھی۔ آجکل اس دالان کے بیچوں بیچ ایک دیوار کھڑی کر کے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جس کے غربی حصّہ میں اندنوں بھی مولانا مولوی قطب الدین صاحب مطب کرتے ہیں۔ اس دالان کی دیواروں میں چند الماریاں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں طلباء قرآن و حدیث و طب یا بعض مستقل مہمان اپنا اپنا سامان ضروری رکھا کرتے تھے اس دالان کے بالائی حصّہ پر آجکل پیر جی سراج الحق صاحب نعمانی کے مکان کا صحن ہے۔ اور شمالی جانب کی دونو کوٹھڑیوں کے اوپر دو کوٹھڑیاں بغرض رہائش برائے پیر جی سراج الحق صاحب نعمانی بنائی گئی تھیں۔ جو آجکل بھی موجود ہیں۔ یہ بالاخانہ سیّدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضور کے ایما کے ماتحت بعض صاحب توفیق مخلصین میں تحریک کر کے امدادی چندہ سے پیر جی سراج الحق صاحب نعمانی کی رہائش کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اور خود حضرتؑ نے بھی بڑی رقم اس میں لگائی تھی

اُس مطب کے جانب غرب موجودہ گلی جانب شرق ڈھاب (ایّام برسات میں ڈھاب اس دلان مطب کی شرقی دیوار کے ساتھ آن ٹکرایا کرتی تھی۔ اور اکثر اندنوں سیّدنا حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اور ہم لوگ بھی دروازہ میں بیٹھکر یا زیادہ سے زیادہ ایک سیڑھی اُتر کر وضو کر لیا کرتے تھے۔) جانب جنوب موجودہ موٹر خانہ جس کے پہلے دو دروازے مطب کی طرف کھلتے تھے۔ جو بعد میں پریس کی گڑگڑاہٹ سے بچنے کی خاطر حضرت مولوی صاحب کے حکم سے بند کر کے الماریوں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ اور جانب شمال دو کوٹھڑیاں جن میں سے ایک کتب خانہ اور دوسری کھلی بطور مسافرخانہ یا مہمان خانہ استعمال ہوتی تھی۔ غربی کوٹھڑی میں ایک کھڑکی جانب کوچہ شارع عام لگی ہوئی تھی۔ اور مشرقی کوٹھڑی میں جانب مشرق ایک کھڑکی تھی۔ ان کوٹھڑیوں کے جانب شمال حضرت مولوی صاحبؓ کا پہلا رہائشی مکان واقعہ تھا۔ جس میں اندنوں مفتی فضل الرحمٰن صاحب بود و باش رکھتے ہیں

والد صاحب کے کھانے کو تشریف لے جانے کے بعد میں بھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گیا۔ والد صاحب کی واپسی میں تاخیر ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا۔ کہ والد صاحب نے سیّدنا حضرت اقدسؑ کا فیصلہ قادیان کے آریہ لوگوں کو بتایا جس کے متعلق صلاح مشورے اور منصوبے ہوتے رہے۔ اور اسی مصروفیت کے باعث جناب والد صاحب جلدی واپس تشریف نہ لا سکے۔

ظہر کی اذان ہو چکی یا ہونے والی تھی۔ میں مطب میں بیٹھا کتاب "ست بچن" کی مسل برداری کر رہا تھا۔ کہ ایک بچہ سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے ایک رقعہ لایا۔ اور زبانی یہ پیغام دیا۔ کہ "اپنے والد صاحب کے دستخطوں سے اس مضمون کی ایک نقل کروا کر ہمیں بھیجدو۔ اور تم اپنے والد صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔"

بچے کے مونہہ سے زبانی پیغام کے الفاظ نکلے اور میرے دل و دماغ میں بیٹھے۔ مگر میں ان الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ دوبارہ اور سہ بارہ پوچھا۔ مگر بچے نے الفاظ ایسے رٹے ہوئے تھے۔ کہ تینوں مرتبہ وہی الفاظ اسی ترتیب سے دہراتا رہا۔ آخر میں نے حضور کا وہ فرمان کھولا۔ پڑھا۔ اور حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئی۔ فرمان کا خلاصہ مطلب میرے اپنے الفاظ میں حسب ذیل تھا:۔

"میں فلاں ابن فلاں جو کہ میاں عبدالرحمٰن (نومسلم) سابق ہریشچندر کا والد ہوں۔ باقرار صالح پرمیشور کے نام کی قسم اٹھا کر جو کہ میرا پیدا کرنے والا ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اِس امر کا پختہ اقرار اور پکا وعدہ کرتا ہوں۔ کہ اپنے لڑکے عبدالرحمٰن سابق ہریشچندر کو دو ہفتہ کے لئے اپنے ساتھ وطن کو لے جاتا ہوں۔ تاکہ اس کی غمزدہ والدہ اور ننھے ننھے بھائی بہنوں کو جو اس کی جدائی کے صدمہ سے بے قرار اور جاں بلب ہیں ملا دوں۔ میں پرماتما کے نام پر

یہ بھی پیمان کرتا ہوں۔ کہ عزیز کو راستہ میں یا گھر لے جا کر کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاؤنگا۔ اور دو ہفتہ کے بعد حسب وعدہ صحیح وسلامت قادیان واپس پہنچا دونگا۔

دستخط

ہنتہ گواندتہ مل موہن بقلم خود۔

میں نے اس مضمون کو پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ حضرت اقدس کے پہلے فیصلہ پر میں خوش تھا۔ مگر اب مجھ پر اداسی اور پژمردگی چھاگئی۔ اور دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا ہونے لگے۔ جی میں آیا۔ کہ قبل اس کے کہ والد صاحب واپس آویں۔ اور اس فیصلہ کا اُن کو علم ہو۔ میں کسی طرف نکل جاؤں کیونکہ میں جانتا تھا۔ کہ والد صاحب مصلحت وقت کی وجہ سے نرم تھے۔ ورنہ وہ میرے اسلام کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف میں ڈالیں گے۔ اور میرا یہ اندیشہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا۔ کہ شائد وہ مجھے زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ اور اس خیال کی تائید میں میرے اپنے گھرانے کے بعض پرانے واقعات میرے سامنے آن موجود ہوئے۔ اور میں نے یقین کر لیا۔ کہ آج ایک بھاری امتحان اور کٹھن گھاٹی میری راہ میں سدِ سکندری آن بنی ہے۔ جس سے سلامت نکل جانا میری طاقت سے بالکل باہر ہے۔ ایسے مشکلات میں مجھے پہلے بھی خدا کی طرف جھکنے کی عادت تھی۔ مگر قادیان کی زندگی اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت کی وجہ سے دعا کی اور زیادہ عادت ہوگئی تھی۔ آخر میں چند منٹ کے لئے تنہائی میں چلا گیا۔ اور خدا کے حضور جھک کر گڑگڑایا۔ اور اس سے امداد چاہی۔ جس کے نتیجہ میں میرا بیٹھتا ہؤا دل اور ٹوٹی ہوئی کمر قوی ہوگئے۔ اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایک سکینت اور اطمینان نازل کر دیا۔ اور خدا کے مسیحؑ کے فرمان کی تعمیل کے لئے دل میں قوت وطاقت پیدا ہوگئی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرونگا۔ خواہ جان بھی اس راہ میں کیوں نہ دینی پڑے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ والد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ میں نے ابھی تک کسی سے حضرت کے اس فیصلہ کا ذکر نہ کیا تھا۔ مگر پیغام لاتے والے بچے کے ذریعہ سے یہ بات عام ہو چکی تھی۔ اور غالباً میرے والد صاحب کو بھی پہنچ چکی تھی۔ جو کہ قریب ہی ڈپٹی شنکر داس کے مکان پر مقیم تھے۔ کیونکہ والد صاحب جب کھانے سے واپس آئے میں نے اُن کے چہرہ کو زیادہ بشاش پایا۔ جس سے میں نے محسوس کیا۔ کہ غالباً اُن تک یہ فیصلہ پہنچ چکا ہے۔

میں نہیں جانتا۔ کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلے فیصلہ کی تبدیلی کے کیا اسباب ہوئے۔ کسی انسان نے کوئی مشورہ دیا۔ یا خود خدائے پاک نے حضورؑ کو پہلے فیصلہ کی تنسیخ کا ایما والقا یا الہام فرمایا۔ میرا قیاس ہے۔ کہ آخر الذکر امر ہی اس فیصلہ کی تبدیلی کا موجب ہؤا ہوگا۔ کیونکہ حضورؑ نے پہلا فیصلہ حالات کے مطالعہ کے بعد ہی فرمایا تھا۔ اور وہ فیصلہ صاف اور ناطق تھا۔ کوئی شرط اس میں نہ تھی۔ اور نہ ہی شبہ کی کوئی گنجائش تھی۔ اور میرا ایمان مجھے اسی یقین کی طرف لے جاتا ہے۔ کہ خدا کے پیارے اور بزرگ نبی اپنے فیصلے خدا کے فرمان کے سوا بدلا نہیں کرتے۔ کیونکہ اُن کے فیصلے ہر وقت حق وحکمت اور عدل وانصاف پر مبنی ہؤا کرتے ہیں۔

بہر حال والد صاحب آئے۔ میں سندہ فرمان اُن کو دیدیا جس کو پڑھ کر انہوں نے قلم دوات لی۔ اور قلم برداشتہ ایک بہت مضبوط معاہدہ لکھ کر دیدیا۔ جو سیدنا حضرت اقدسؑ کے الفاظ سے بھی کہیں زیادہ قوی اور حلف سے مؤکد تھا۔ والد صاحب نے بجائے پرمیشور کے نام کی سوگند کے الفاظ لکھنے کے شروع ہی ان الفاظ سے کیا۔ کہ

"میں فلاں ابن فلاں خدائے واحدہٗ لاشریک کے نام کی قسم اٹھا کر یہ اقرار کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ"

والد صاحب کی تحریر پختہ تھی۔ کیونکہ وہ خوشنویس اور پکے منشی تھے۔ فارسی زبان میں اُن کو خاص مہارت تھی جسکی وجہ سے مضمون نویسی اور انشا پردازی کا ملکہ اُن میں تھا۔ اُن کا تحریر کردہ معاہدہ سیدنا حضرت اقدسؑ کے حضور پہنچا۔ حضور نے ملاحظہ فرما کر محفوظ کر لیا۔ اور مجھے پھر حکم بھیجدیا۔ کہ

"تم اب اپنے والد صاحب کے ساتھ چلے جاؤ"

والد صاحب نے وہ معاہدہ سرِعام لکھا۔ جس کا علم تمام دوستوں کو ہوگیا۔ اور اب عام چرچہ ہوگیا۔ کہ عبدالرحمٰن کو اس کے والد صاحب ساتھ لے جائیں گے۔ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب گھر میں تھے۔ اُن کو بھی اطلاع ہوگئی حضورؑ کے اس فیصلہ کا اثر ہمارے ڈیرہ میں گونہ غم اور افسردگی کے رنگ میں اور ہندو بازار اور ہندو گھرانوں میں خوشی وشادمانی کی شکل میں ظاہر ہؤا۔ بعض دوستوں نے گھبراہٹ تک کا بھی اظہار کیا۔ اور اس فیصلے کو اپنی شکست سمجھ کر مغموم بھی ہوئے۔ مگر فیصلہ چونکہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ اس وجہ سے کسی کو مجال سخن نہ ہوئی۔ اور سب نے میرے ساتھ ملکر سر تسلیم خم کیا۔

ظہر کی نماز کے لئے سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اور حضرت مولانا مولوی عبدالکریمؓ صاحب بھی حاضر تھے۔ نماز ادا ہو چکی۔ اور حضور مسجد ہی میں تشریف فرما ہوئے۔ خاموشی کا عالم تھا۔ اور چاروں طرف ایک سناٹا چھایا ہؤا تھا۔ اور کسی قدر غیر معمولی طور سے حضورؑ پر نور بھی خاموش بیٹھے رہے حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے ایک کونہ میں بیٹھے تھے۔ آپ کی عادت مبارک یہ تھی۔ کہ حضورؑ کی موجودگی میں بہت کم کلام فرماتے۔ اور حتی الوسع کلام میں ابتداء نہ فرماتے۔ مگر آج غیر معمولی طور پر اس مہر خاموشی وسکوت کو آپ ہی نے ان الفاظ سے جن میں ادب واحترام اور دربار نبوت کی شان کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا تھا۔ یوں توڑا کہ:۔

"حضور نے بھائی عبدالرحمٰن کو ان کے والد صاحب کے ساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ جس علاقہ میں وہ جائیگے سکھوں اور غیر مسلموں سے گھرا ہؤا ہے۔ اور بہت دور ہے حضور اگر پسند فرمائیں۔ تو بھائی عبدالرحیم کو اُن کے ساتھ بھیجدیا جائے۔ تاکہ اُن کی خبر وخیریت اور حال واحوال تو پہنچتا رہے۔ اور...."

حضرت مولوی صاحبؓ ابھی کچھ اور عرض کرنا چاہتے تھے۔ کہ حضورؑ پرنور نے مولوی صاحب کو یوں مخاطب فرمایا اور اسوقت حضورؑ کا چہرہ مبارک سُرخ تھا۔ آواز میں ایک جلال شوکت اور رعب تھا۔

"نہیں مولوی صاحب ہمیں نام کے مسلمانوں کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ("اگر" کے لفظ کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ یقین نہیں غالب خیال یہ ہے کہ "ہمارا ہے تو آجائیگا") ہمارا ہے تو آجائیگا۔ ورنہ کوڑا کرکٹ جمع کرنے سے کیا حاصل۔"

میں جن ایام میں قادیان پہنچا۔ اُس زمانہ میں حضورؑ پُرنور عموماً بہت لاغر ونحیف ہؤا کرتے تھے۔ حضورؑ کا چہرہ مبارک زرد رہتا تھا۔ چنانچہ پہلے روز میں حضور کو پہچان بھی نہ سکا۔ جب تک حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم ومغفور نے مجھے یہ نہ بتایا۔ کہ حضرتؑ صاحب یہ ہیں۔ حضور کی صحت عام طور پر اس زمانہ میں زیادہ کمزور تھی۔ مگر جب کبھی بھی کوئی خاص بات کا موقعہ پیش آتا حضور کا چہرہ مبارک سُرخ لعل کی مانند دمکنے لگا کرتا تھا۔ اور ایسا معلوم ہؤا کرتا تھا۔ کہ حضورؑ سے بڑھکر شباب اور جوانی کسی پر آئی ہی نہیں۔

یہی رنگ آج کی صحبت میں دیکھنے میں آیا۔ حضرت مولوی صاحب جو پہلے ہی مراقبہ میں تھے۔ حضور کے اس فرمان کی وجہ سے اور بھی جھک گئے۔ اور ایک لفظ بھی نہ دہرایا۔ حضور پُرنور اُٹھے۔ اور اندر تشریف لے گئے مجھ غمزدہ کو اتنی بھی جرأت نہ ہوئی۔ کہ دست بوسی ہی کر لیتا۔

مجلس برخاست ہوگئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قیام گاہ کو چلے گئے۔ جن سے میں مصافحہ کر سکا کر لیا۔ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب بھی اپنی حرم سرائے کو تشریف لے گئے۔ میں مسجد سے نیچے اُترا۔ والد صاحب میری انتظار میں کھڑے تھے۔ مجھے جلدی تیاری کا حکم دیا۔ اور فرمایا۔ کہ یکہ تیار ہے۔ یکے والا جلدی کر رہا ہے۔ تم جلدی کرو۔ اور حق بھی یہ ہے۔ کہ اب ان کو حق بھی پہنچتا تھا۔ کہ جو بھی فرماتے فرما سکتے تھے۔ کیونکہ فیصلہ اُن کے حق میں ہو چکا تھا۔

خدا نے مجھے ایک رویا دکھائی تھی۔ جو آج کے دن سے پہلی رات کے بعد سحری کے وقت ہوئی تھی۔ اس میں ایک حصّہ حضرت مولانا مولوی نورالدینؓ صاحب کے متعلق بھی تھا۔ کہ انہوں نے "اس سانپ کو جبکہ وہ میری طرف لپکا آرہا تھا۔ ایک لاٹھی رسید کی تھی۔ مگر اس لاٹھی کا سانپ پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ اور وہ بچکر مجھ سے لپٹ گیا"

میں سمجھتا ہوں۔ کہ حضرت مولانا رضؓ کی وہ لاٹھی ہی تھی۔ جو آپنے حضرت اقدس ؑ کے حضور بھائی عبدالرحیم صاحب کو میرے ساتھ بھجوانے کی تجویز کی صورت میں چلائی تھی۔ مگر غیر مؤثر ہو کر رہ گئی۔

میں نے جلد جلد اپنے چند پارچات اور قرآن کریم۔ حزب المقبول اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دو تین کتب جو میرے پاس تھیں باندھیں۔ اور بزرگوں دوستوں محسنوں بھائیوں اور رفیقوں سے وداعی سلام کرنے لگا۔ میں بہتوں سے ملا اور بہت سے مجھے ملنے کو تشریف لائے۔ آخر میں روانگی کے وقت اپنے محسن حضرت مولانا نورالدین صاحب کے در دولت پر بھی حاضر ہوا۔ دروازہ پر آواز دی۔ سلام کیا۔ نام پوچھا گیا۔ اجازت ملی۔ اندر پہنچا دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت مولانا رضؓ چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور دو تین خادم حضور کو چاپی کر رہے ہیں۔ میں نے جھکا اور سلام کیا۔ حضور نے بیٹھے ہی بیٹھے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ میرے لئے دعا سفر فرمائی۔ اور مجھے دلاسا دیکر نصیحت کی۔ اور اللہ حافظ کہا۔

میں اس نقشہ کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ اور آج پورے چالیس سال کے بعد جب میں اس واقعہ کو حوالہ کاغذ کر رہا ہوں۔ وہ نقشہ ہو بہو میرے سامنے موجود ہے۔ اور وہی تأثرات آج بھی میرے دل میں موجزن ہیں۔ ایسا کہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ وہ واقعہ آج ہی ہوا۔ یا ہو رہا ہے۔ یعنی مفتی فضل الرحمٰن صاحب والے موجودہ مکان کے والان میں جس کے دو دروازے شمالی جانب صحن میں کھلتے تھے غربی جانب کے دروازہ کے اندر دروازہ کو چھوڑ کر دروازہ کے مشرقی جانب آپ کا پلنگ بچھا تھا۔ آپ رو بقبلہ لیٹے ہوئے تھے۔ سر مبارک شمال کی جانب تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ جب کہ مجھے حضور نے گلے لگایا۔ کہ حضور کو شدید بخار تھا۔ اور غمخواری کی وجہ سے آواز میں بھرّاہٹ تھی گویا۔ کہ آپ بحالت کظیم تھے۔ آپ کی محبت اور شفقت سے میرے پیش آمدہ غم و درد کا پیمانہ چھلک پڑا۔ اور میں زار و قطار رونے لگا۔ اور یہی نہیں کہ میں رو پڑا۔ بلکہ میں نے دیکھا۔ اور اب بھی وہ نظارہ میرے سامنے ہے۔ کہ حضرت مولانا مرحوم و مغفور بھی چشم پُر آب ہو رہے تھے۔ غرض ایسے ہی پُر درد اور جانگداز حالات میں سے گذرتا ہوا میں اپنے والد صاحب کے آگے آگے چل پڑا۔ جن کو میں اپنا عزرائیل بھی اگر ان حالات کی موجودگی میں کہوں۔ تو شائد گناہ نہ ہو۔ میں خدائے بزرگ و برتر سے ڈرتا ہوں۔ کہ والد صاحب کی گستاخی کرنے والا گردانا جا کر معصیت کا مرتکب سمجھا جاؤں۔ وہ میرے والد تھے میں اُن کا فرزند۔ پھر اُن کے بے انتہا احسان ہیں اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ اُن کا احترام کرنا چاہیئے اور کرتا ہوں۔ اُن کی زندگی میں بھی کیا۔ اور اب بھی دل میں ہے۔ کیونکہ اسلام نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔ کہ

ان کی زیادہ سے زیادہ فرمانبرداری کروں۔ اور اُن کیلئے اُف تک نہ کہوں۔ عزرائیل کا لفظ میں نے صرف واقعہ کی اصلیت اور اپنی تکلیف کے ثقل و سختی کی بنا پر استعمال کیا ہے۔

الغرض میں اپنے آقا، اپنے ہادی و راہنما، اپنے پیشوا و مقتداء کے حکم کی تعمیل میں اپنے والد صاحب کے ساتھ قادیان کی مقدس بستی سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میرا دل غمگین اور اداس ہے۔ آنکھیں آنسو نہیں خون ٹپکا رہی ہیں۔ اور سچ سچ میں یہ سمجھ رہا ہوں۔ کہ گھر کو نہیں ماں اور بھائی بہنوں کی طرف نہیں بلکہ موت کے مونہہ میں دھکیلا جا رہا ہوں۔ میرے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ اور بجائے آگے اٹھنے کے پیچھے کو پڑتے ہیں۔ میرے دوست، میرے پیارے مجھے الوداع کہنے کو میرے ساتھ آ رہے ہیں۔ اور جہاں مجھے استقلال و استقامت کی تلقین فرماتے ہیں۔ میرے والد صاحب سے سفارش بھی کرتے ہیں۔ کہ ان کو جلدی بھیج دینا۔ تکلیف نہ دینا۔ اور سوائے زبانی ہمدردی کے اور وہ بے چارے کر بھی کیا سکتے تھے والد صاحب ان میں سے کسی کو یہ فرما دیتے۔ کہ اسے مرغ پال رکھے ہیں۔ اُن کو ختم کر کے واپس آ جائے کسی کو فرما دیتے۔ کہ ان کی والدہ روتے روتے اندھی ہو گئی ہے۔ ان کی آنکھوں کی روشنی کے لوٹتے ہی واپس آ جاوے۔ اور کسی سے کہتے۔ کہ اس کے پیارے بھائی بہن اس کی جدائی میں روتے روتے نڈھال ہیں۔ میں نے ان کو جاں بلب چھوڑا ہے۔ نہیں معلوم میری واپسی تک وہ زندہ بھی ہونگے یا نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوں۔ تو اُن سے مل کر اُن کو دلاسا دیکر انکو چہرہ دکھا کر واپس آ جاوے ورنہ اُن کی مڑھیاں ہی دیکھ آوے۔ تا ہمارے سینہ کی آگ تو ٹھنڈی پڑ جاوے۔ وغیرہ وغیرہ

خاکروبوں کے پٹڈرہ تک جہاں اس زمانہ میں مرزا نظام الدین صاحب کا آموں کا باغ تھا۔ بہت سے دوست اور ہم عمر مجھے رخصت کرنے کو گئے۔ جہاں ایک یکہ کھڑا تھا۔ اور بدقسمتی سے وہ بھی اجنبی تھا۔ غفار کا ہوتا۔ تو شائد بٹالہ ہی سے کوئی پیغام اس کے ہاتھ بھیج سکتا۔ اس پر مجھے والد صاحب نے سوار کرایا اور خود بھی سوار ہوئے۔ اور اس طرح میں اس نہائت ہی پیاری بستی سے بادل ناخواستہ رخصت ہو گیا۔ آہ!

کسی مصلحت الٰہی کے ماتحت اس سلسلہ تحریر میں تعویق ہوتی چلی گئی۔ اور گوناگوں مصروفیتوں مجبوریوں اور معذوریوں کے باعث ایک لمبے عرصہ تک باوجود خواہش کے وقفہ ہو گیا۔ اور کم و بیش دو سال کے بعد آج اس سلسلہ کو شروع کرنے کی توفیق ملی ہے۔

اگرچہ اس التواء کے اسباب و علل ظاہری وہی ہیں۔ جو اوپر درج ہوئے مگر اس التواء و فترت کو حقیقتاً میری اس روحانی کشمکش۔ اضطراب اور بیقراری سے ایک باریک اور پنہاں در پنہاں مناسبت بھی ہے۔ جو قادیان سے باہر جانے کے وقت میرے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کا بیان لفظوں میں ناممکن اور جس کا اظہار تحریر کی برداشت سے باہر ہے۔ اس قلبی کیفیت کو آشکارا کرنے سے قوت تخیل اور قوت بیان دونو عاجز و قاصر ہیں۔

مجھے اس بات کا بے حد افسوس اور رنج ہے۔ کہ میں وہ چیز دنیا کو دکھانے سے قاصر ہوں۔ جس نے مجھے مہر مادری اور شفقت پدری اور حب برادری تک بھلا دی میری جاں نثار ہمشیرہ (عزیزہ متھرا) میری حسین خاندانی ہمعصر بیوی اور میرے رفیق دوست معزز اور مہربان بزرگان خاندان جن کو اپنے خاندانی شرف اور شاندار روایات پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ مجھ سے چھڑا دیئے۔ میرا خاندان، میرا وطن عزیز اور میرا آبائی مذہب تک مجھ کو بھلا دیا۔ جس کی آواز دنیا میں آتے ہی میرے کان میں ڈالی گئی۔ اور جسکی تلقین متواتر بندرہ سال تک مجھے خاص توجہ کی جاتی رہی تھی۔ میں شرمندہ ہوں اپنی کمزوری اور کم مائگی کا اقرار کرتا ہوں۔ اور مجھے اعتراف ہے۔ کہ مجھ سے حق شہادت ادا نہیں ہو سکتا جو میرے ذمہ ہے۔ اور اگر عمر بھر ہانگ دہل نقارے کی چوٹ گلے میں دن ڈالے دیہہ بدیہہ، شہر بشہر اور کو بکو منادی بھی کرتا پھروں۔ تب بھی میرا ضمیر یہی کہیگا "حق تو یہ ہے۔ کہ حق ادا نہ ہوا۔"

جس زمانہ میں اللہ تعالےٰ نے محض اور محض اپنے فضل سے میرے سینہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ میری آنکھوں کو بینائی بخشی۔ اور کفر و ضلالت گمراہی و جہالت کے اتھاہ گڑھے سے نکال کر مجھے اوج سعادت پر پہنچایا۔ اور دولت ایمان سے مالا مال فرما کر نوازا بدقسمتی سے وہ زمانہ ایسا زمانہ تھا۔ کہ تبدیلی مذہب کی وجوہات زن۔ زر یا زور کے سوا کچھ اور سمجھی ہی نہ جا سکتی تھیں۔ اور اظہار اسلام کرنے والے ہر کسی پر یہی شبہات کئے جاتے تھے۔ کہ (۱) کسی مسلمان عورت سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ (۲) یا کسی مسلے نے دھوکہ دیکر سبز باغ دکھا کر اغوا کر لیا ہے۔ (۳) یا والدین کی سختی و بدسلوکی کے باعث اُن کے ظلم و شدت سے تنگ آ کر بھاگ نکلا ہوگا۔ وغیرہ۔ ورنہ مذہبی صداقت اور روحانی حقانیت سے متاثر ہو جانا۔ اور راستی کے آگے سر تسلیم خم کر کے دنیا و مافیہا کو خیرباد کہ دینا۔ اور بغیر کسی مادی طمع، دنیوی لالچ یا خوف و بیم کے خالصتاً خدا کی رضاء کی تلاش و پیاس میں کسی کا نکلنا دنیا کے ماننے اور قبول کرنے میں آیا ہی نہ کرتا تھا۔

مگر میں علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اگرچہ میرے ماں اور باپ دونوں اس دنیا میں موجود نہیں۔ اُن کی مڑھیاں سنتی ہیں۔ کہ (۱) وہ میرے لئے نہائت ہی مہربان اور شفیق واقعہ ہوئے تھے۔ اور نہ صرف معمولی بلکہ غیر معمولی طور سے وہ مجھ پر مہربان تھے۔ اُن کا سلوک مجھ سے ہمیشہ کریمانہ تھا۔ اور اُن کو مجھ سے بالکل غیر معمولی محبت تھی۔ مجھے اُن کی زندگی میں اُن کے گھر کے اندر ہر قسم کی فارغ البالی اور کشائش و آزادی حاصل تھی۔ جو

اوسط درجہ کی زندگی سے نکل کر خوشحالی کا غالب رنگ اپنے اندر رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میرے اسلام کی خاطر گھر سے نکل آنے پر میرے والدین نے میری تلاش اور واپسی کی کوششوں میں ہزاروں روپیہ صرف کر دیا۔ اور جب دیکھا۔ کہ میں کسی رنگ میں بھی اس دولت ایمان کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں۔ تو ناچار اپنی ساری کوششوں کو چھوڑ کر ہتھیار ڈالدیئے۔ اور خود بہنوں میرے پاس آکر رہا کئے جس سے ثابت ہے۔ کہ اُن کو جہاں مجھ سے نہائت درجہ محبت تھی۔ وہاں وہ میرے اظہار اسلام کی حقیقت اور صداقت کو بھی مان گئے تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ اس کی وجہ کوئی طمع یا خوف نہیں بلکہ خالص اور سچی روحانی پیاس و تڑپ ہے۔

(۲) کبھی کسی مسلمان کو نہ صرف یہی کہ مجھے کسی رنگ میں تبلیغ کرنے کی توفیق نہ ملی۔ بلکہ اگر میں نے کسی سے استفادہ بھی کرنا چاہا۔ تو اُس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ یا پہلو تہی کی۔ کہ تمہارے رشتہ داروں سے ہمیں خوف آتا ہے۔

(۳) میں شادی شدہ تھا۔ میری بیاہتا میری ہم عمر اور خوش شکل ہونے کے علاوہ ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کو مجھ سے گہرا تعلق تھا۔ اور وہ میرے پاس رہتی تھی۔

الغرض اللہ تعالےٰ کے فضل سے مجھے زمانہ کی بدمذاقی و بدشگونی سے بہمہ وجوہ نجات تھی۔ اور مجھے خدا تعالےٰ خالصتًا اپنی محبّت کیلئے نوازا۔ اور دولت ایمان اور نور اسلام سے مالا مال فرمایا ہوا تھا۔ اور میرے وجوہات اسلام خدا کے فضل سے نہائت پاک اور زر خالص کی طرح ہر قسم کی ملونی سے مبرّا تھے جنکی مجمل سی تشریح اوپر عرض کر چکا ہوں۔

ان حالات میں وہ کونسی طاقت تھی جس نے ایکطرف تو میرے تینے بھاری اور پختہ زنجیروں کو توڑ دیا۔ کہ نہائت ہی محسن اور شفیق والدین اور جان سے عزیز بھائی بہنوں اور گہرے دوستوں اور بزرگوں کی محبت کو مجھ پر ایسا سرد کر دیا۔ کہ نہ صرف اُن کی کوششوں ہی کو مجھے ٹھکرانا پڑا۔ بلکہ اُن کی منت وسماجت سے بھی بڑھکر التجاء و لجاجت تک کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور میں نے اُن کے ساتھ جانے تک سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف وہ کونسی اقت، کونسا جذب اور کونسی قوت مقناطیسی تھی جس میں جکڑا گیا۔ جس کو باوجود صد ہزار کوشش میرے والدین توڑنے یا ڈھیلا کرنے تک سے بھی عاجز آگئے۔ افسوس میں وہ دنیا کو دکھا نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ مادی نہیں۔

یہ سچ ہے۔ کہ قادیان پہنچنے سے قبل ہی بچپنے میں میرے دل میں تخم اسلام کاشت کر دیا گیا تھا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس کشتِ اسلام کی آبیاری و پرورش اگر اس ہادیٔ کامل اور باغبان روحانی کے ہاتھوں نہ ہوتی۔ جس کو خدائے دوجہاں نے آخری زمانہ کا نبی و رسول کر کے بھیجا تھا۔ تو وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکتی۔ اور میری کشتیٔ ایمان جو بحر ناپیدا کنار کی طوفانی موجوں کے بھنور میں پڑی ٹھوکریں کھاتی تھی۔ ہرگز کنارے نہ لگتی۔ اگر یہ نوحِ زماں ناخدا بن کر مجھے نہ بچا لیتا۔ میرے ایمان میں حلاوت پیدا ہوئی۔ تو اسی مردِ خدا نما کے انفاسِ طیبہ کے طفیل سے اور مجھے روحانی زندگی ملی۔ تو محض اور محض اسی وجود باجود کی روحانی نفخ اور دم مسیحائی کی بدولت۔ ورنہ حق یہ ہے۔ کہ میں بھی محض ایک رسمی مسلمان ہو کر آخر کفر میں جذب ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ اس وقت زندہ ایمان اور کہیں تھا ہی نہیں۔

پس میری نشأۃ اور حیات روحانی، میرا ایمان اور حلاوتِ ایمانی اُسی سرچشمۂ فیوض و برکات سے ہوئی۔ جسے خدائے اسلام نے جان جہاں بنا کر اس مردہ دنیا کے لئے مسیحا بنا کے مبعوث فرمایا۔ اور جس کا جام زمانے کے مردوں کیلئے زندگی بخش جام بنا ؎

زندگی بخش جامِ احمدؑ ہے، کیا ہی پیارا یہ نام احمدؑ ہے

اس انسان کامل کے اوصافِ حمیدہ اور کمالات روحانیہ کا بیان ہزاروں صفحات اور عمر نوح چاہتا ہے۔ میں کون اور میری بساط کیا۔ کہ ان کا بیان کروں۔ وہ سراسر رحم اور مجسمۂ رحمت وہ پیکرِ حلم، خدا کی رحمت اور اُس کے حلم کا نمونہ تھا وہ ذاتِ والاصفات اپنے خالق و مالکِ حقیقی کی محبّت میں کھویا ہوُا۔ اور اس کے رنگ میں ایسا رنگا گیا تھا۔ کہ خود مظہرِ صفاتِ الٰہیہ ہو گیا تھا۔ ہر قسم کا حسن اور خوبی اُس کی ذات پر ختم تھی۔ مہربانی میں ہر مادرِ مہربان سے اور شفقت میں ہر شفیق باپ سے وہ کہیں بڑھا ہوُا تھا۔ اتنا کہ مہربان سے مہربان مائیں اور شفیق سے شفیق باپ اس کی مہربانی، محبت و شفقت نے لاکھوں انسانوں کی یاد سے اتار دیئے۔

پس میرے آقا۔ میرے ہادی و راہنما کی قوت قدسی و جذب اور حضورِؑ پرنور کے اخلاقِ کریمانہ اور فیض روحانی نے میرے دل کی لوح پر وہ کچھ لکھدیا۔ جو پھر نہ مٹا اور خدا کرے کہ کبھی نہ مٹے۔ اور ایسا ہوُا۔ کہ میں دنیا کی بادشاہی پر اُس کے در کی گدائی کو عزت یقین کرنے لگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سے جدائی میرے واسطے ایک بھیانک موت نظر آرہی تھی۔ اسی وجہ سے دو سال ہوئے یکّے کو خاکروبوں کے پنڈارہ پر کھڑے کئے ہوئے ہوں۔ اور دل اس حق نما وجود اور اس کی مقدس بستی سے نکلنا پسند نہیں کرتا۔

میں جس زمانہ کے واقعات قلمبند کر رہا ہوں۔ اُس زمانہ میں قادیان ایک گمنام اور نہائت ہی مختصر سی بستی تھی جس میں زیادہ تر کچّے اور خستہ حال مکانات اور بہت تھوڑی سی آبادی تھی۔ اندرون آبادی اراضی اور مکانات کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اور بعض اوقات تو مفت کے برابر اراضی قیمت اٹھاتی تھی۔ مالکان مکان خواہش رکھتے تھے۔ کہ مفت میں ہی کوئی اُن کے مکان میں بود و باش رکھے۔ بازار برائے نام تھا۔ کیونکہ کوئی کاروبار نہ تھا۔ اکثر محلے کھنڈر اور سنسان تھے۔

سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاں کچھ رونق مستقل مہمانوں اور آنے جانے والے احباب کی رہتی تھی۔ مگر وہ بھی ایسی نہ تھی۔ کہ موجودہ زمانہ کی آبادی یا آنے جانے والے مہمانوں سے اُسے کوئی نسبت دی جا سکے۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ یا بیس مستقل مہمان اور درویش لوگ تھے۔ اور مسجد مبارک باوجود اپنی پہلی تنگی کے ہم پر فراخ رہا کرتی تھی۔ جس میں بارہا خدا کا اولوالعزم نبی جری اللہ فی حلل الانبیاء تن تنہا نماز کیلئے تشریف لے آیا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوُا۔ کہ باوجود انتظار کے جب اور کوئی نہ پہنچا۔ تو حضورؑ نے کسی کو بلا کر اذان کہلوائی۔ بلکہ ایک مرتبہ تو مجھے یاد ہے۔ کہ حضورؑ نے خود بھی اذان کہی۔ حضورؑ کی آواز گو ہلکی تھی۔ مگر نہائت دلکش اور سُریلی آواز تھی۔ جس میں لحن داؤدی کی جھلک اور گویا نفخ صُور کا سماں بندھ رہا تھا۔

نماز اس زمانہ میں حضرت مولانا مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم سیالکوٹی پڑھایا کرتے تھے۔ اور جماعت کی صف اول دوسرے کمرہ میں کھڑی ہوتی تھی۔ جو اس وقت درمیانی حصّہ تھا۔ سیدنا حضرت اقدس مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت الفکر میں سے کھڑکی کے راستہ تشریف لایا کرتے اور کھڑکی سے ذرا آگے کو بڑھ کر دیوار کے ساتھ ہی یعنی صف اوّل کے بالکل دائیں جانب کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں درمیانی کمرہ مسجد میں دو صفیں ہوُا کرتی تھیں۔ اور اسی طرح کمرہ سوم یعنی غسلخانہ سے مغربی جانب والے حصّہ میں (جسمیں نیچے سے اوپر آنے والی سیڑھی کھلا کرتی تھی) بھی دو ہی صفیں ہوُا کرتی تھیں۔ اور ہر صف میں معمولی پتلے دُبلے آدمی زیادہ سے زیادہ چھ اور بھاری بھرکم صرف چار کھڑے ہو سکتے تھے۔

نمازیں عموًما اوّل وقت میں ہو جایا کرتی تھیں۔ صبح کی نماز کا تو یہ عالم تھا۔ کہ ابھی اندھیرا ہی ہوُا کرتا تھا۔ کہ ختم بھی ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوُا ہے کہ صبح کی اذان صبح ہونے سے قبل ہی ہو جاتی۔ اور نہ صرف یہی بلکہ نماز بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اور بعد میں پتہ لگتا تھا۔ کہ ابھی تک صبح ظاہر نہیں ہوئی۔ مگر نماز کبھی دہرائی نہ گئی۔ چونکہ اذان ان دنوں عموًما حافظ معین الدین صاحب (حافظ معنا) کہا کرتے تھے۔ اور وہ آنکھوں سے معذور تھے۔

نماز تہجد کا اُن دنوں زیادہ التزام ہوُا کرتا تھا اور قریبًا سبھی لوگ نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ تہجد کی نماز کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ دعا و استغفار میں مشغول رہتے حتّٰی کہ اذان ہو جاتی تھی۔ اذان سنکر دو رکعت سنت بھی عموًما اپنے اپنے ڈیروں ہی پر پڑھکر مسجد میں آتے اور جماعت کی انتظار میں خاموش ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔

تہجد اور نوافل کا اتنا چرچہ تھا۔ کہ اس کی وجہ سے کئی روز تک میں ایک غلطی کا مرتکب ہوتا رہا۔ وہ یہ کہ چونکہ صبح کی دو سنت عموًما دوست گھر میں ہی پڑھکر آتے تھے۔ میں باوجود اس علم کے کہ صبح کی نماز

دو سنت اور دو فرض پر مشتمل ہے۔ اس غلطی کا مرتکب رہا کہ صبح کی دو سنتیں نہ پڑھیں۔ آخر ایک روز جبکہ کوئی نئے مہمان آئے۔ اور وہ جماعت کھڑی میں شریک ہوئے جسکی وجہ سے پہلی دو سنت نہ پڑھ سکے۔ انہوں نے جماعت کے بعد دو سنت ادا کیں تو مجھے حیرت اور تعجب ہوُا۔ کہ فرائض کے بعد صبح کی تو کوئی نماز نہیں۔ یہ دوست کیوں پڑھ رہے ہیں۔ اس پر مجھے کسی دوست نے بتایا۔ کہ صبح کی پہلی دو سنت ان سے رہ گئی تھیں۔ وہ ادا کر رہے ہیں تب جا کر مجھے ہوش آیا۔ اور میں سنبھلا۔ اور اپنی غلطی کا ازالہ کرنے لگا۔ ورنہ میں بھی تہجد کی نماز اپنی جگہ پر ادا کر لیا کرتا۔ مگر سُنن پہلے چند ایام خیال سے اتری ہی رہیں۔ نماز اشراق، ضحیٰ اور صلوٰۃ الاوابین کا بھی اس زمانہ میں خاصہ چرچا تھا۔

حضرت مولانا مولوی عبدالکریم رضؓ صاحب مرحوم کو اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف سے ایک عشق عطا فرمایا تھا۔ اور نہایت خوش الحانی اور جوش سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی آواز نہایت بلند مگر دلکش تھی۔ ایسا بھی ہوُا کرتا تھا۔ کہ اُن کی قرأت سے بعض اوقات گہری نیند سوتے ہوئے دوست بیدار ہو جایا کرتے تھے۔

سیّدنا حضرت مولانا مولوی نورالدین رضؓ صاحب بعض اوقات صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے باہر آجایا کرتے۔ اور ہم لوگوں کو صبح صادق اور صبح کاذب میں امتیاز بتایا کرتے تھے۔ اور نجوم کے متعلق بھی بعض باتیں سمجھایا کرتے تھے۔ جن کے ذریعہ سے ہمیں رات کی اندھیری گھڑیوں میں وقت کا اندازہ کرنا آسان ہوتا تھا۔

مسجد مبارک جس میں سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پنجوقتی نمازیں ادا فرماتے تھے اس زمانہ میں (۱۸۹۵ء) حسب ذیل شکل میں تھی۔

بجانب غرب ایک چھوٹا سا حجرہ جو شمالاً جنوباً ۴ فٹ ۶ انچ (اندروں کے اندر اندر) اور شرقاً غرباً ۴ فٹ ۷ انچ (اندرون کے اندر اندر) تھا۔ اس حجرہ میں دو کھڑکیاں اور ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ ایک کھڑکی غربی دیوار میں تھی۔ جو آجکل بھی اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ اسوقت بھی اور اب بھی مرزا گُل محمد صاحب کے مکان کی چھت پر کھلتی ہے۔ دوسری کھڑکی شمالی دیوار میں تھی۔ اور اب بھی کسی قدر تغیر کے ساتھ وہیں موجود ہے۔ فرق صرف یہ واقعہ ہوُا ہے۔ کہ پہلے یہ کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اور اس کے سامنے کوئی روک نہ تھی۔ مگر آجکل (۱۹۳۴ء کے جلسہ کے قریب کے زمانہ سے) اس کو کسی قدر نیچا کر کے ایک راستہ کی شکل دیدی گئی ہے۔ اور سیّدنا حضرت اقدس خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی آمد و رفت کا راستہ بنا دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اب وہ گلی میں نہیں کھلتی۔ بلکہ ایک بند گیلری میں کھل کر اندرون الدار جانے کا راستہ بناتی ہے۔ اور عموماً بند رہتی ہے۔ صرف ایام جلسہ میں حضور اس راہ سے تشریف لیجاتے ہیں۔ یا کسی اور خاص ضرورت میں کام آتی ہے)

مسجد میں سے حجرہ میں داخلہ کا دروازہ بھی بالکل چھوٹا سا۔ بلکہ ایک کھڑکی ہی کے برابر تھا۔ نہ دروازہ کی طرح کھلا تھا نہ اونچا، جھک کر اندر داخل ہوُا کرتے تھے۔ یہ دروازہ یا کھڑکی جو بھی نام رکھا جائے جنوبی کونہ میں تھا۔ اور شمالی کونہ میں اسطرح تھوڑی سی جگہ نکلتی تھی۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں بعد میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام امام کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز گزارا کرتے تھے۔ اسی حجرہ کی شرقی دیوار کے شرقی جانب یعنی مسجد مبارک کے حصّہ اول کی طرف اوپر چھت کے قریب

من دخلہ کان آمنا

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

مُبَارَکٌ وَّمُبَارِکٌ وَّکُلُّ اَمْرٍ مُّبَارَکٍ یُّجْعَلُ فِیْہِ

اور غالباً رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ لکھّا ہوُا تھا۔

دوسرا حصّہ مسجد مبارک کا اُس حجرہ کی جانب شرق واقعہ تھا۔ اور حجرہ اور اس حصّہ کو ایک دیوار جدا کرتی تھی۔ اس حصّہ کا طول شرقاً غرباً ۹ فٹ ۱۱ انچ اور عرض شمالاً جنوباً ۷ فٹ ۱۱ انچ تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں اور دو دروازے کھلتے تھے ایک تو وہی کھڑکی یا دروازہ جو حجرہ میں کھلتا تھا۔ اور دوسرا دروازہ مشرقی حصہ اور اس کی درمیانی دیوار میں تھا۔ ایک کھڑکی بیت الفکر میں سے مسجد مبارک کے اس حصّہ میں کھلتی تھی جس میں سے سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام تشریف لایا کرتے تھے۔ اور یہ کھڑکی اسوقت تک (۱۹۳۶ء) اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ اور یہ مسجد کی شمالی دیوار میں ہے۔ (بیت الفکر مسجد کے شمالی جانب واقعہ ہے) ایک کھڑکی جنوبی دیوار میں لگی ہوئی تھی۔ جو اُن ایام میں ایک ویران خراس کے کھنڈر کی طرف کھلتی تھی۔ جو مرزا نظام الدین وغیرہم کی ملکیت میں تھا۔ اور بعد میں (۱۹۰۶ء / ۱۹۰۷ء) خرید کر حضور مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو مسجد میں (اوپر کا حصّہ اور نیچے دفاتر میں) تبدیل فرما دیا۔ مسجد مبارک کا یہی وہ حصّہ ہے جس میں ابتداءً سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام صف اول میں کھڑے ہو کر صف کے بالکل دائیں جانب دیوار شمالی کے ساتھ لگ کر نماز باجماعت ادا فرمایا کرتے یا حضورؑ کا دربار لگا کرتا تھا۔ میں نے بھی اُسی حصہ میں سب سے اوّل مرتبہ حضورؑ کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان دنوں اس حصّہ میں عموماً دو صفیں کھڑی ہوتی تھیں اور بعض ضرورتاً تین بھی کھڑی ہوتی رہی ہیں۔

مسجد مبارک کا تیسرا حصّہ اس حصہ کے مشرقی جانب واقع تھا۔ اور ان دونوں حصّوں کے درمیان میں ایک دیوار حائل تھی۔ اور ایک دروازہ جو قریباً درمیان میں تھا۔ اُن کو باہم ملاتا تھا۔ اس حصّہ کا طول شرقاً غرباً ۹ فٹ ۴ انچ اور عرض شمالاً جنوباً ۷ فٹ ۵ انچ تھا۔ اور اس میں ایک کھڑکی جنوبی دیوار میں جو وہ بھی اسی ویران خراس کے کھنڈر میں کھلتی تھی۔ اور تین دروازے تھے جن میں سے ایک مسجد کے درمیانی حصّہ میں کھلتا تھا۔ اور باقی دو میں سے ایک نیچے سے اوپر آنیوالی سیڑھیوں کا اور دوسرا وہ تھا جو غسل خانہ میں جاتا تھا جہاں اس زمانہ میں (۱۸۹۵ء) غسل اور وضو کیلئے پانی رکھا ہوتا تھا۔ یہی وہ حصّہ ہے جس کو یہ عزت حاصل ہو۔ کہ اللہ تعالےٰ کی قلم کی سُرخی کے نشانات عالم وجود میں نمودار ہو کر حضورؑ پُرنور کے کُرتے اور میاں عبداللہ صاحب سنوری مرحوم کی ٹوپی پر پڑے۔ اور ایک سیڑھی لکڑی کی بھی اس کے مشرقی حصہ میں لگی ہوئی تھی۔ جو مسجد کے اُوپر جانے کیلئے گول کمرہ کی چھت پر کھلتی تھی۔ اور پھر گول کمرہ کی چھت سے دوسری سیڑھی کے ذریعہ اس غسلخانہ کی چھت پر جاتے تھے۔

اور چونکہ غسلخانہ کی چھت اصل مسجد سے نیچی تھی۔ لہذا ایک تیسری سیڑھی تھی جس کے ذریعہ سے مسجد میں پہنچتے تھے۔ مگر اب اسمیں تغیرات ہو چکے ہیں۔ مسجد مبارک کے تیسرے حصّہ کی آخری دیوار پر مشرقی جانب یعنی غسلخانہ کی چھت سے اوپر جو حصّہ دیوار تھا۔ اس پر کشتی کی شکل بنی تھی۔ اور کچھ اور بھی لکھا تھا جسمیں سے ایک تو یہ

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر اوست

لکھّا تھا۔

آجکل جو ایک دروازہ مسجد مبارک کے بالکل مشرقی حصّہ میں الدار سے کھلتا ہے۔ یہ دروازہ پہلے نہ تھا۔ بعد میں کھولا گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں اس دروازہ کے اندر کے حصّہ میں ایک لکڑی کی سیڑھی ہوُا کرتی تھی جس کے ذریعہ سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اندرون خانہ سے مسجد مبارک کے بالائی حصّہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں جو دروازہ مسجد مبارک کی اصل چھوٹی سیڑھیوں سے اندرون الدار جانے کا تھا۔ وہ آجکل بند ہے اور موجودہ دروازہ اسکی جا بجا کام دیتا ہے۔

سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نماز باجماعت کے علاوہ سنن و نوافل اندرون خانہ ادا کرتے تھے۔ پہلی سنتیں عموماً پڑھ کر گھر سے تشریف لاتے اور پچھلی سنتیں گھر میں تشریف لے جا کر ادا فرماتے تھے۔ البتہ ابتدائی زمانہ میں جبکہ حضور شام کی نماز کے بعد عشا کی نماز تک مسجد ہی میں تشریف فرمایا کرتے تھے۔ حضور شام کی نماز کی سنتیں مسجد ہی میں ادا کرتے تھے۔ دو سنت ادا فرماتے تھے جو ہلکی ہوتی تھیں۔ مگر سنوار کر پڑھی جاتی تھیں۔ کوئی جلدی یا تیزی اُن میں نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ایک اطمینان ہوتا تھا۔ مگر وہ زیادہ لمبی نماز نہ ہوتی تھی۔

ان کے علاوہ بھی کبھی کبھار حضورؑ کو مسجد مبارک میں سنت ادا کرتے دیکھا۔ مگر ہمیشہ حضورؑ کی نماز آسان اور ہلکی ہوُا کرتی تھی۔ چند مرتبہ حضورؑ کی اقتداء میں نماز باجماعت ادا کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ مگر وہ نماز بھی حضور کی بہت ہی پُر لطف مگر ہمیشہ ہلکی ہی ہوُا کرتی تھی؛ ابتداء میں اکثر حضورؑ کے ساتھ لگ کر حضورؑ کے پہلو بہ پہلو بھی نماز باجماعت ادا کرنے کا شرف ملا ہے اور اس کیلئے ابتدائی زمانہ ہی میں ہمیں خاص اہتمام کی ضرورت پڑا کرتی تھی

اور ہم میں سے اکثر کی یہ خواہش ہوتی تھی۔ کہ حضور کے ساتھ ملکر کھڑے ہونے کی جگہ حاصل کریں۔

حضورؑ کو میں نے نماز میں کبھی رفع یدین کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی آمین بالجہر کرتے سنا۔ تشہد میں حضورؑ شہادت کی انگلی سے اشارہ ضرور کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے کبھی نہ دیکھا کہ حضورؑ نے انگلی کو اکڑایا یا پھرایا ہو۔ صرف ہلکا سا اشارہ ہوتا تھا۔ جو عموماً ایک ہی مرتبہ اور بعض اوقات دو مرتبہ بھی ہوتا تھا۔ جو میرے خیال میں امام کے تشہد کو لمبا کرنے کی وجہ سے حضور کلمۂ شہادت دہراتے ہوئے کیا کرتے ہوں گے۔

حضورؑ نماز میں ہاتھ ہمیشہ سینہ پر باندھتے تھے۔ زیرِ ناف بلکہ ناف پر بھی میں نے کبھی حضورؑ کو ہاتھ باندھے نماز ادا کرتے نہیں دیکھا۔

حضورؑ پرنور خود امام نہ بنا کرتے تھے۔ بلکہ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم و مغفور کو حضورؑ نے نمازوں کی امامت کا منصب عطا فرمایا ہؤا تھا۔ نماز جمعہ بھی حضور خود نہ پڑھاتے تھے۔ بلکہ عموماً مولوی صاحب موصوف ہی پڑھاتے تھے اور شاذ و نادر حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالےٰ عنہ پڑھایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی بھی پڑھاتے تھے۔ ایک زمانہ میں دو جگہ جمعہ کی نماز ہوتی تھی۔ مسجد اقصٰی میں بھی جو کہ جامع مسجد ہے اور مسجد مبارک میں بھی۔ مگر دونو جگہ امام الصلوٰۃ حضورؑ نہ ہوتے تھے۔ عیدین کی نماز بھی سوائے شاذ کے حضورؑ خود نہ پڑھاتے تھے۔ نماز جنازہ عموماً حضور خود پڑھاتے تھے۔ اور حضورؑ کو میں نے نماز جنازہ کسی کے پیچھے پڑھتے نہیں دیکھا۔ یا کم از کم میری یاد میں نہیں

حضورؑ کی عادت مبارک تھی۔ کہ صبح کی نماز کے بعد کچھ دن نکلے سیر کے واسطے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور سیر میں جانے سے پہلے حضرت مولوی صاحب خلیفہ اوّل رضؓ کو بھی اطلاع کرا دیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ بھی ساتھ ہوں۔ بعض اوقات اُن کی انتظار بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کو ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ ابتداء میں حضور بٹالہ کی سڑک کی طرف سیر کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اور کم از کم موڑ تک جاتے تھے۔ گاہ گاہ موڑ سے آگے بٹالہ کی جانب بھی تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دو مرتبہ نہر تک جانا بھی حضور کا مجھے یاد ہے۔

اس کے علاوہ میں حضور کے ہمرکاب جانب شرق قادر آباد (نیا گاؤں) کی طرف سے بسراواں کی طرف اور قادر آباد (نیا گاؤں) سے شمالی جانب کے راستہ سے جو قادر آباد (نیا گاؤں) اور بھینی کے درمیان سے جاتا ہے۔ اس راستہ پر بھی سیر کو گیا ہوں۔ چند مرتبہ ننگل باغباناں کی جانب بھی حضور سیر کے واسطے تشریف لے گئے ہیں۔ اور کاہلواں تک سیر فرمائی ہے۔

حضورؑ قادیان سے شمال کی جانب موضع بوٹر کیطرف بھی سیر کے واسطے تشریف لیجایا کرتے تھے۔ اور بعض دفعہ حضورؑ اپنے باغ کی طرف جو شہر سے جانب جنوب واقع ہے۔ بھی سیر کے واسطے گئے ہیں۔ باغ سے آگے لیلاں کیطرف ایک راستہ جاتا ہے۔ اسطرف کو اور بعض اوقات حضورؑ باغ ہی میں ٹھہر کر سیر فرماتے اور بعض پھل منگا کر خدام کو کھلاتے۔ اور خود بھی شریک ہؤا کرتے تھے خصوصاً شہتوت، بیدانہ اور آم۔

کبھی کبھی حضورؑ کمر میں ایک پٹکا بھی باندھا کرتے تھے۔ ہاتھ میں حضور کے چھڑی ضرور ہؤا کرتی تھی۔ جو عموماً موٹے بید کی اور کھونٹی دار ہؤا کرتی تھی۔

حضورؑ کوٹ پہنے بغیر سیر کے واسطے کبھی تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ جوتی حضورؑ کی ہمیشہ دلیسی ہوتی تھی بوٹ میں نے کبھی حضورؑ کو پہنے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ ایک گرگابی کسی نے حضورؑ کے واسطے بھیجی یا پیش کی تھی۔ مگر اُس کے الٹے سیدھے کا حضورؑ کو خیال نہ رہتا تھا۔ اور اس وجہ سے حضورؑ کو تکلیف ہوتی تھی۔ آخر چھوڑ دی تھی۔

حضورؑ سیر میں تشریف لے جاتے۔ تو حضورؑ کے ہمرکاب اکثر مقامی دوست اور مہمان ضرور ہوا کرتے تھے۔ حضور سیر میں بھی دینی باتیں فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات نئی تصانیف کے مضامین باتوں باتوں میں سنا دیا کرتے تھے۔ دوستوں کے سوالات کے جواب بھی دیا کرتے تھے۔ اور اس طرح جاتے اور آتے سارا وقت اسی قسم کی گفتگو میں خرچ ہؤا کرتا تھا اور یہ ایک قسم کا شاندار دربار رواں کا نقشہ ہؤا کرتا تھا۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضؓ چلنے میں کمزور تھے حضورؑ پُرنور کی رفتار تیز تھی۔ مگر تیزی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ ایک وقار اور سنجیدگی لئے ہوئے ہؤا کرتی تھی۔ حضرت مولوی صاحب لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہولے ہولے چلا کرتے تھے۔ اور اکثر حضورؑ کے پیچھے رہ جاتے تھے۔ حضورؑ کو معلوم ہوتا۔ تو حضورؑ ان کی انتظار میں ٹھہر جایا کرتے تھے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضؓ ہی پر کیا منحصر ہے۔ اور بھی بعض دوست حضورؑ کے ساتھ اور حضورؑ کی باتیں سننے کی غرض سے بجائے چلنے کے دوڑ دوڑ کر ساتھ ہؤا کرتے تھے۔

چند مرتبہ جانب شمال کی سیر سے واپسی پر حضورؑ بازار میں سے بھی معہ خدام گذرے ہیں۔ جب حضورؑ بازار میں سے گذرتے تو دوکاندار کیا ہندو اور کیا سکھ سبھی حضور کے لئے ادب سے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اور کوئی کوئی سلام بھی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضورؑ اڈہ خانہ والے بازار میں سے بھی گزرے تھے اس وقت حضورؑ کے ساتھ خدام کی بھاری تعداد تھی۔ اور چونکہ وہ بازار ڈھلوان ہے۔ لہذا وہ نظارہ نہائت ہی شاندار اور دلکش تھا۔

ایک موقعہ پر غالباً جلسہ کے ایام تھے۔ بوٹر کی طرف حضورؑ سیر کے واسطے تشریف لے گئے۔ تو حضورؑ کے ساتھ بڑی بھیڑ تھی۔ گرد و غبار بہت اڑتا تھا۔ چلنا دشوار ہوگیا۔ حضورؑ تھوڑی دور جا کر کھلے کھیتوں میں (میدانی شکل تھی فصل نہ تھی) ٹھہر گئے۔ اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بعض دوستوں نے الگ الگ حضورؑ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ اُس دن قادیان سے شمالی جانب ایک بہت بڑی چھاؤنی کا نظارہ تھا۔

ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا۔ کہ حضور مردوں کیساتھ سیر کرنے کو تشریف نہ لے جاتے تھے۔ بلکہ صرف مستورات ہی حضورؑ کے ہمرکاب جایا کرتی تھیں۔ سیدۃ النساء حضرت ام المومنین ہمرکاب ہوتیں۔ اور شاہزادگان بھی۔ بعض خدام مستورات بھی جایا کرتی تھیں۔ مگر یہ سیر زیادہ تر بسراواں کی طرف قادر آباد (نیا گاؤں) سے آگے نکل کر اونچی زمین (دمبرا) تک ہؤا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ حضورؑ بیگمات اور خادمات کے ساتھ باغ میں تشریف فرما تھے۔ غالباً عصر کے بعد کا وقت تھا باغ میں حضور سیدۃ النساء حضرت ام المومنین کے ساتھ ٹہلتے پھرتے تھے۔ کہ یکایک حضورؑ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا "جلدی کرو۔ چلو واپس گھر چلیں۔ سخت اندھیری اور بادل آرہا ہے۔ سیدۃ النساء حضرت ام المومنین نے عرض کیا۔ کہاں ہے بادل اور کہاں کی اندھیری کچھ بھی تو نظر نہیں آرہا۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی بدلی آسمان پر نمودار ہوئی۔ اور حضورؑ نے سیدۃ النساء حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کو دکھا کر پھر جلدی واپسی کو کہا۔

مستورات باغ میں ادھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن کے اکٹھا ہونے میں دیر لگی۔ ادھر باد و باران کا ایک طوفان عظیم سامنے آگیا۔ اور ابھی حضورؑ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب والے باغ ہی میں تھے۔ کہ سخت بارش اور دن کو رات بنا دینے والی آندھی آن پہنچی۔ سیدۃ النساء حضرت اُم المومنین کا ہاتھ حضورؑ پُرنور نے پکڑ رکھا تھا۔ اور اُن کو لئے آرہے تھے۔ بارش کے باعث کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔ سب سے آگے حضورؑ پُرنور تھے اور پیچھے منفرق متفرق دوسری عورتیں تھیں۔

چونکہ ہم لوگوں کو معلوم تھا۔ کہ حضورؑ بیگمات کیساتھ سیر کے لئے باغ کی طرف تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جس کسی سے ہو سکا۔ حضورؑ کو لینے کیلئے باغ کی طرف بڑھے۔ مدرسہ کے لڑکے بھی اس کام کے واسطے دوڑے۔

جب میں حضورؑ کے قریب پہنچا۔ تو حضورؑ نے فرمایا۔ ہم تو اب اللہ کے فضل سے آن پہنچے ہیں۔ پیچھے عورتیں بہت متفرق ہیں۔ اور خطرہ ہے۔ کہ کوئی اندھیرے کی وجہ سے ڈھاب میں نہ گر جائے۔ اُن کی مدد کرو۔

چنانچہ ہم سے جو کچھ ہو سکا۔ مستورات کی اس پریشانی میں ان کی خدمت کی کوشش کی۔ عورتوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ بعض کے برقعے اڑ گئے۔ زیور گر گئے۔ راستہ بھول گئیں۔

میں نے حضورؑ پرنور اور سیدۃ النساء حضرت ام المومنین کو اس جگہ واپس آتے دیکھا تھا۔ جہاں آجکل مرزا محمد اشرف صاحب کا مکان واقع ہے۔